حرف و حکایت

جوش ملیح آبادی

مکتبۂ اردو لاہور

(متعلقہ انجمن ترقی اردو [illegible])

طبع سوم   جولائی   سنہ ۱۹۴۳ء

تعداد اشاعت   گیارہ سو

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد پرنٹر و پبلشر نے چھپ کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی

فہرست مضامین

شعر کی آگ

میری نظمیں، آتشِ سوزاں کا ہے جن پر گماں
سننے والے! یہ تو ہیں سیلی ہوئی چنگاریاں

فکرِ بے پروا نے سینے سے نکالا ہے جنہیں
ناطقے نے برف کے سانچے میں ڈھالا ہے جنہیں

اُن کا اِک پرتو بھی آ سکتا نہیں اشعار میں
سانس لیتے ہیں جو شعلے اِس دلِ بیدار میں

یہ مرے نغمے نظر آتے ہیں جو تپتے ہوئے
سب کے سب ہیں شبنمِ الفاظ سے بھیگے ہوئے

کیا ملے گی میری نظموں کے خس و خاشاک میں
وہ سنہری آگ، روشن ہے جو میری خاک میں

کیا کہوں، وہ آگ، جو رگ رگ کو پگھلاتی ہوئی
دوڑتی پھرتی ہے اِس سینے میں بل کھاتی ہوئی

الاماں وہ سوزِ پنہانی، جو میرے دل میں ہے
آہ اُس شعلے کی عریانی، جو میرے دل میں ہے

ولولے اِس روح کے آتے ہیں جب ہیجان میں
سنسناہٹ آنچ کی آتی ہے میرے کان میں

بجلیاں میری اگر کھنچ آئیں میرے راگ میں
ناطقہ تبدیل ہو جائے دھکتی آگ میں

سننے والے جل اُٹھیں، شورِ فغاں اُٹھنے لگے
پڑھنے والے کی رگ و پے سے دھواں اُٹھنے لگے

نقطہ نقطہ برقِ خاطف بن کے ضَو دینے لگے
حرف گل جائیں، لبِ گفتار لَو دینے لگے!!

لہ میں ایطاء کا پابند نہیں۔

اُٹھا ساغر، کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے، آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی

سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اُدھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اِدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اُدھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعویٰ محکم
اِدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

اُدھر شدت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا
اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہو گی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں برجِ ہما اک رہنِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حامل نہیں غمہائے پنہاں کا
یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں، تو ناکامی سُلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو
مشیت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظؔ و خیّامؔ ہے ساقی

شاعر کی بخششیں

زمانے کو اوجِ نظر بخشتا ہوں
جو جھکتا نہیں ہے وہ سر بخشتا ہوں

ادب کر مرا کشورِ ہند ادب کر
کہ لاکھوں دلوں کو نظر بخشتا ہوں

مری قدر کر اے خدائے تجلّی
کہ شامِ وطن کو سحر بخشتا ہوں

گدا ہوں، مگر وہ گدائے غنی دل
کہ تاج و کلاہ و کمر بخشتا ہوں

دلِ خس کو دیتا ہوں بجلی کی شوخی
صدف کو مزاجِ گہر بخشتا ہوں

کہاں تک یہ فریاد اے مرغِ بسمل
اِدھر آ کہ میں بال و پر بخشتا ہوں

جسے بخشتا ہوں حیاتِ جوانی
بہ اندازۂ بحر و بر بخشتا ہوں

کالج کے نوجوانوں سے

مری طرف سے سنا دو یہ نوجوانوں کو
کبھی تمہاری طرح تابدار تھے ہم بھی

تمہیں یہ فرصتِ سیر و شکار راس آئے
کبھی فدائی سیر و شکار تھے ہم بھی

تمہاری شوخیِ پیہم سے یاد آتا ہے
کہ ایک روز یونہیں بے قرار تھے ہم بھی

خرامِ ابرِ بہاراں تمہیں مبارک ہو
کبھی سحابِ سرِ کوہسار تھے ہم بھی

کبھی حیات کی رنگیں صدف کے سینے میں
تمہاری طرح دُرِ شاہوار تھے ہم بھی

تم آج شعلہ و سیماب کے نمونے ہو
کبھی تبسّمِ برق و شرار تھے ہم بھی

تمہاری ذات ہے آج آرزوئے مستقبل
کبھی امانتِ لیل و نہار تھے ہم بھی

تم آج گلشنِ ہستی کے موسمِ گل ہو
کبھی حیات کی فصلِ بہار تھے ہم بھی

یہ داستان تو کل کی ہے جب لڑکپن تھا
اور آج کشتۂ بیدادِ روزگار ہیں ہم

ہر ایک سانس تھی کل نغمۂ ربابِ حیات
اور آج گریۂ شمعِ سرِ مزار ہیں ہم

کل اہتمامِ سرِ برگِ بوستاں تھا اور آج
فریب خوردۂ رنگینیِ بہار ہیں ہم

کل آب و رنگِ تمنا سے روح تھی سرشار
اور اب مآلِ تمنا سے شرمسار ہیں ہم

سوادِ ابلقِ ایام کل تھا اپنا غرور
اور آج مرکبِ غمہائے روزگار ہیں ہم

طلوعِ صبحِ درخشاں سے کل تھے گرمِ خروش
اور آج شامِ غریباں پر اشکبار ہیں ہم

امیدِ نشۂ فردا سے کل تھے محوِ سرود
اور آج عمرِ گزشتہ کے سوگوار ہیں ہم

کل ایک دھوم سی تھی مقدمِ جوانی کی
اور اب وداعِ جوانی سے بے قرار ہیں ہم

کل ایک خواب کا آغاز تھا فسوں بردوش
اور آج اخواب کی تعبیر سے دوچار ہیں ہم

سنو کہ حکم، زمانہ سنانے والا ہے
بہ ہوش باش کہ یہ دن بھی آنے والا ہے

تمہیں خبر بھی ہے اس دل شکن حقیقت کی؟
کہ دہر شیوہ کالج سے سازگار نہیں

سند سے آس لگائے ہوئے ہو نوخیزو
سند سے بڑھ کے کوئی شے ذلیل خوار نہیں

ہزار حیف کہ اب تک تمہیں نہیں معلوم
حیات، خون کا دھارا ہے آبشار نہیں

ہوائے لالہ و نسریں پہ جھومنے والو
ہوائے لالہ و نسریں پہ اعتبار نہیں

بس اک گمانِ جوانی ہے ورنہ حسن کہاں
بس اک فریبِ نظر ہے، جمالِ یار نہیں،

ادب ہے ہیچ، اگر دست و پا نہیں مضبوط
قلم ہے پوچ، اگر تیغ آبدار نہیں

جو زخم سر سے میسر نہ ہو، وہ تاج غلط
جو خونِ دل سے نہ پیدا ہو وہ بہار نہیں

زمانہ آدمیوں کا شکار کرتا ہے
کہ اس شکار سے بہتر کوئی شکار نہیں

خزاں ہے گھات میں اور خوگرِ بہار ہو تم
خدا گواہ، شکاری نہیں، شکار ہو تم

مقامِ شیخ

مقامِ شیخ کا قائل ہوں میں بھی
یہ پاپڑ تو بہت بیلے ہوئے ہیں

یہی ابلیس کی جمعیتوں کو
جہنم کی طرف ریلے ہوئے ہیں

خیالِ حور میں تڑپے ہیں برسوں
کہیں ودان میں البیلے ہوئے ہیں

انہیں پیرِ طریقت کی بدولت
ہمیشہ عرس کے میلے ہوئے ہیں

صلوٰۃ بے ریا کی وادیوں میں
ہزاروں سختیاں جھیلے ہوئے ہیں

یہ مشقِ کاروبارِ ضربِ یاہو
مہینوں سر سے ٹنڈ بیلے ہوئے ہیں

ہزاروں کو بنا ڈالا ہے چیلا
ہزاروں بار خود چیلے ہوئے ہیں

خدا کو اور نہ پہچانیں یہ حضرت!
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں!

فتنۂ خانقاہ

اِک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ　　پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ　　ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لاالٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں، دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں　　جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اُٹھنے لگا دھواں　　ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد، حسن کا پروانہ ہو گیا

اُس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں، نہ پوچھ　　نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں، نہ پوچھ
رُخ پر ہوائے شام کی گل باریاں، نہ پوچھ　　کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں، نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اُس گلعذار کا
گویا نزول، رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں، خمِ چوگاں لئے ہوئے　　چوگاں کے خم میں گوئے دل و جاں لئے ہوئے

رُخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لیے ہوئے　　کافر گھٹا کی چھاؤں میں خیزراں لیے ہوئے

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے

یا کوئی نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ، عشوۂ آہن گداز کی　　لہریں، ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی

پلٹیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی　　آئینے میں دمک، رُخِ آئینہ ساز کی

آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی

سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں　　موجیں شرابِ سُرخ کی آنکھوں کے جام میں

رنگِ طلوعِ صبح، رُخِ لالہ فام میں　　چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

اِنساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں

ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں　　یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں

چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں　　یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی

یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اُس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے — آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے — دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اِک سمت پھر گئی
اِک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دُعا سے جو وہ مشعلِ حرم — کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم — انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اُٹھا کہ ترے ساتھ جائینگے — اے حُسن! تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اِس جگہ سے اپنا مصلّے اٹھائینگے — قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہونگے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح، زہد کا ڈھلنے لگا غرور — پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور — رُخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور

ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سُرخ ہوئی، اور گل گئی

پل بھر میں زلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی — دم بھر میں پارسائی کی بستی اجڑ گئی

جس نے نظر اٹھائی، نظر رُخ پہ گڑ گئی — گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

طوفانِ آب و رنگ میں زُہّاد کھو گئے

سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد، حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے — انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے

ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے — کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

القصہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا

کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

لے کا بادل

اِک ولولۂ رقصاں تھے ہواؤں میں شرارے
دنیا کے تھے اوسان خطا دھوپ کے مارے

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ زباں پھیر رہے تھے
خورشید کے آغوش میں تپتے ہوئے ذرّے

ذرّے تھے کہ آتش کی چٹکتی ہوئی کلیاں
جھلسے ہوئے بازار، دہکتی ہوئی گلیاں

بے مہر حرارت کی ستاتی ہوئی دُنیا
مُضطر تھی پسینے میں نہائی ہوئی دُنیا

کرنوں کی زبانوں پہ تھا دوزخ کا فسانہ
اُس آگ میں دفتر کی طرف تھا میں روانہ

پہلو سے مِرے تان اُڑاتا ہوا گزرا
اک طفلکِ گل فام یہ گاتا ہوا گزرا

"جنگل کی ہوائیں"
"جنگل کی ہوائیں، ارے جنگل کی ہوائیں"
"جنگل کی ہوائیں"

ناخن کی کبھی کور اک انداز سے کھٹکی
جھوما کبھی گانے میں بجاتا ہوا چٹکی

"جنگل کی ہوائیں"
"جنگل کی ہوائیں، ارے خنگل کی ہوائیں"
"خنگل کی ہوائیں"

یہ سُنتے ہی جیسے ہی نظر میں نے اٹھائی
اک آن میں بدلی ہوئی دُنیا نظر آئی

خنجر پہ شعاعوں کے معاً رنگ سا دوڑا
لو دیتی ہوئی خاک پر اک رنگ سا دوڑا

تپتے ہوئے ذرّات کو انگڑائی سی آئی
اور آنکھ، دہکتے ہوئے سُورج نے جھکائی

اللہ رے اُس طفلکِ رنگیں کی صدائیں — چلنے لگیں نرمی سے دبے پاؤں ہوائیں

"جنگل کی ہوائیں"

"جنگل کی ہوائیں، ارے جنگل کی ہوائیں"

"جنگل کی ہوائیں"

گھبرا کے کڑی دھوپ نے دامن کو سمیٹا — دامن کے سمٹتے ہی جو دیکھا تو یہ دیکھا

خورشید پہ زلفیں سی ہیں لہرائی ہوئی سی — گویا سرِ گردوں ہے گھٹا چھائی ہوئی سی

میں ایک مہکتے ہوئے جنگل میں رواں ہوں — جنگل میں ہے اک نہر بل کھائی ہوئی سی

سرسبز و دل آویز ہے گھنگھور گھٹا میں — وہ گھاس کہ تھی دھوپ سے مرجھائی ہوئی سی

کہتے ہیں جسے حسرتِ دیرینۂ باراں — وہ حسرتِ دیرینہ ہے بر آئی ہوئی سی

غنچوں کی طرح خار میں ہلکی سی ہے خوشبو — پھولوں کی طرح خاک ہے اترائی ہوئی سی

کس ناز سے بالائے ہوا لوٹ رہی ہے — جنگل سے پپیہے کی صدا آئی ہوئی سی

جھومی سی ہواؤں میں مچلتی سی گھٹائیں — اک نیند سی کونین کو ہے آئی ہوئی سی

"جنگل کی ہوائیں"

"جنگل کی ہوائیں، ارے جنگل کی ہوائیں"

"جنگل کی ہوائیں"

یہ تان ہے بادل کی طرح چھائی ہوئی سی

"جنگل کی ہوائیں"

"ارے جنگل کی ہوائیں"

برسات کی چاندنی

چرخ پر برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے جابجا
چاندنی، تالاب، سناٹا، پپیہے کی صدا

دشت پر چھائے ہوئے ذوقِ جنوں کے ولولے
چاند میں معصوم بچے کے تبسم کی ادا

فصلِ سرما میں سحر کو غسل کر چکنے کے بعد
رنگ ہے جیسے کسی معشوق کا نکھرا ہوا

سینۂ امواج میں سیال چاندی کی تڑپ
طاقِ گل میں قطرۂ شبنم کا چھوٹا سا دیا

نرم شاخوں کی لچک، سرشارِ ساحل کا سکوت
دشت کی خوشبو، فضا کی تازگی، ٹھنڈی ہوا

جانستاں کلیوں کے عقدے نور سے سلجھے ہوئے
دلربا سنبل کا دامن اوس میں ڈوبا ہوا

موجزن ہے اتصالِ ماہ و جوئے تند میں
وہ طرب کا دورِ کرب افزا، کہ تھا بھولا ہوا

موسمِ باراں کی رو میں چاند شفاف و رقیق
مینہ کے چھینٹوں کے اثر سے آسماں نکھلا ہوا

کانپتی لہروں سے اٹھتے ہیں نمو کے زمزمے
جھومتے پودوں سے آتی ہے جوانی کی صدا

لرزشِ صہبا میں جھلکے جس طرح نشے کی روح
چاند ہے اس طرح قلبِ آب میں ڈوبا ہوا

شبابِ مرعوبِ شیب

اِک پیر کے پاس کچھ جھجکی سی — بیٹھی ہے خموش ایک لڑکی

احساس کا خلفشار رُخ پر — پیری کے ادب کا بار رُخ پر

خامی پہ نگاہِ پختہ کاری — غنچے پہ خزاں کا رعب طاری

پیری کے جھکے نڈھال کاندھے — دریائے طرب کا بند باندھے

طوفاں کی سحر جمود کی رات — شعلے کی جبیں پہ برف کا ہات

افسردہ ہے دامِ جزر میں کُل — پژمردہ ہے جیبِ خار میں گُل

تخریب کے سائے میں ہے تعمیر — نظروں میں پڑی ہوئی ہے زنجیر

بے چین ہے حسن کی تب و تاب — کھلنے کے لئے کلی ہے بے تاب

سینے میں ہے محوِ پرفشانی — پیری سے جھجکی ہوئی جوانی

عشووں کا لہو بہ سوگواری — عارض کے خطوط میں ہے جاری

حسن آتشِ غم میں جل رہا ہے — کانٹوں پہ شباب چل رہا ہے

رہ رہ کے حواس کھو رہی ہے — اینٹھن سی رگوں میں ہو رہی ہے

اُٹھنے کے لئے نظر ہے بیتاب — آنکھوں میں تڑپ رہے ہیں گرداب

بے چین ہے ذوقِ خود نمائی — ہلچل میں ہے خونِ دلربائی

سینے میں اُمس سی ہو رہی ہے
بیدار ہے یُوں کہ سو رہی ہے

کاکُل کے مزاج پر خدا را
اے شیب کی ریش! رحم فرما

دے اِذن کہ دام تو بچھا لے
شانوں پہ مچل کے لہر کھا لے

ارباب نظر پہ وار کر لے
کونین کا دل شکار کر لے

گلبانگِ نوشانوش[1]

اُٹھا ساغر کہ بیداری وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

ترے آزادہ مشرب روزہ خواروں کی تمنا میں
ہلالِ عید اک کھلتا ہوا آغوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے وقت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگِ نوشانوش ہے ساقی

پسینہ آ گیا ہے خلد میں حوروں کے ماتھے پر
حسینوں کی جوانی آج یُوں گل پوش ہے ساقی

اگر اک بوند ٹپکا دوں تو لَو دینے لگے دُنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اُٹھا لے جامِ زر اِس کو پلا جامِ سفالیں میں
کہ یہ کونین کا ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی

[1] عید کا چاند دیکھ کر یہ نظم کہی گئی تھی۔

چلائے جا تلوار

ہاں سُنے محبوبِ جیلانی لکھنؤ کے واقعات[1]
کھول اے خونِ جوانی گونج اے شیرِ حیات

شرم اے ہنگامہ پرور "حاملِ امن و اماں"
بے خطا اللہ کے بندوں پہ برسیں گولیاں

ماؤں کی آغوش سے معصوم بچے چھین کر
خاک پر اس طرح پھینکے جائیں کیوں اے خیرہ سر

خون کے آنسو بہاؤ اے زمین و آسماں
فوجِ بد بیں میں گھریں ہندوستاں کی بیٹیاں

سر قلم ہوں ساز و برگِ تاجداری کے لئے
خون چھڑکا جائے کشتِ شہریاری کیلئے

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے خود فروش خود پسند
نوعِ انسانی کا سر ہے تاجِ شاہی سے بلند

اے بباطن محض اک "بقال" اے ظاہر میں "شاہ"
پہلے جیبوں پر نظر تھی اب ہے جانوں پر نگاہ

بھیڑیوں کے طور سے انساں کا کرتا ہے شکار
خاک ہو جائے جہاں بانی کے جھوٹے اقتدار

بے کسوں کے خون کو نامرد، سمجھے جا حلال
دیکھ، خنجر تولنے پر ہے مشیت کا جلال

---

[1] سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کے اندر بے خطا اور غیر مسلح مجمع پر پولیس نے گولی چلائی تھی۔

عورتوں کی عصمتیں، بچوں کے دل، بوڑھوں کے سر
ہاں چڑھائے جا جہانبانی کی قرباں گاہ پر

ہاں کئے جا آبگینے زندگی کے چور چور
آچلی ہے عاجزی کی نبض میں موجِ غرور

پیٹ کے بل رینگنے دے خاک پر اولادِ قہر
آچلا ہے سانپ کا اِس رینگنے سے ہم میں زہر

ہاں سروں پر یوں ہی پیہم ٹھوکریں اے ہرزہ کار
ڈھل رہا ہے جنگ کے سانچے میں ذوقِ انکسار

ہاں یونہیں چلتی رہے تا دیر تیغِ شعلہ فام
کروٹیں لینے لگا ہے دِل میں جوشِ انتقام

ہاں لئے جا کام یوں ہی آتشیں قانون سے
لَو نکلنے ہی پہ ہے مشرق کے ٹھنڈے خون سے

آگ کا بادل، فرازِ چرخ پر چھانے کو ہے
اے حکومت کے چمن بادِ سموم آنے کو ہے

ٹھوکریں کھاتا پھرے گا کج کلاہی کا غرور
دب کے بھیجے سے نکل جائیگا شاہی کا غرور

اشارۂ مشیّت

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیّت کا
کہ ہر نظام کے ہمراہ ابتری بھی رہے

موحّدوں کو رہے اختیارِ بُت شکنی
برہمنوں کے لئے اذنِ آذری بھی رہے

طلسمِ کوثر و تسنیم بھی نہو باطل
شرابِ ناب کی موجِ فسونگری بھی رہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش
زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

فسونِ طرزِ "والشّمس" "واللّیل" کے مقابل کو
کرشمہ سازیِ گیسوئے دلبری بھی رہے

شعارِ عجز و سرِ انکسار کے ہمراہ
سرشتِ حضرتِ انساں میں خود سری بھی رہے

مذاقِ بندگی و ذوقِ سجدہ کے باوصف
مزاجِ آدمِ خاکی میں داوری بھی رہے

غرضکہ حکمِ مشیّت یہ ہے کہ دُنیا میں
پیمبری بھی رہے اور کافری بھی رہے!

گمنام ولولے

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا
سر پہ ٹیکا، نہ ہات میں چھلّا

اُفقِ حسن پر بصد تب و تاب
ہو رہی ہے طلوع، صبحِ شباب

آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے
بن کی جانب نظر اٹھائے ہوئے

گرتے گرتے سنبھل رہا ہے کوئی
خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی

انکھڑیوں میں خفیف طرّاری
خواب کا ہے سماں نہ بیداری

رُوح بے داغ، چہرہ نورانی
رُخ پر اک ناتمام حیرانی

ایک اِطلاق سا، نہ کیف، نہ کم
نہ تغافل کی خُو نہ ذوقِ کرم

ایک بھٹکی ہوئی سی شانِ حجاب
ایک کھویا ہوا سا استعجاب

ناشنیدہ فسانہ آنکھوں میں
وحشتِ آہوانہ آنکھوں میں

لب پہ اک نیم رس تبسم سا
رات کا جیسے آخری لمحہ

رُوح میں ایک کش مکش کا ظہور
جیسے ہلچل ہو کوئی تحتِ شعور

دل میں رقصاں ہے رُوحِ بادِ شمال
اپنے نافے سے مضطرب ہے غزال

دل میں ہے اِک تلاش سی مبہم
یہ بھی لیکن اُسے نہیں معلوم

کہ مرے دل کا مدعا کیا ہے
یہ رگ و پے میں درد سا کیا ہے

مضطرب ہے کہ یہ مقام ہے کیا
آخر اِن ولولوں کا نام ہے کیا!

پیرزنِ لیگ

کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرتِ آزادؔ[۱]
آغوش میں ظلمت کے ہے سہما سا اُجالا

سہمے سے اُجالے میں ہے اِک پیرزنِ تند
اوڑھے ہوئے شبہائے جوانی کا دوشالا

یوں گرمِ سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا
کر دوں گی میں اسلام کی دنیا میں اُجالا

اِک بوند میں بہ جائے گی تعمیرِ دو عالم
چھلکے گا مرے صبر کا جس وقت پیالا

ہاں لیگ ہوں، اسلام کی دیرینہ مجاہد
ہر بات مری تیغ ہے ہر سانس ہے بھالا

کافر کو جلاتی ہوں سرِ نارِ جہنم
مومن کو عطا کرتی ہوں جنّت کا قبالہ

آ ہی نہیں سکتا مرے مُنہ "لالۂ" بزدل
میں پاک، وہ ناپاک میں گوری ہوں، وہ کالا

کیا اُس کا مرا ذکر، وہ دیسی ہیں بدیشی
میں مصر کی مسجد وہ بنارس کا شوالا

گنگا کی ہر اک لہر میں غلطیدہ ہے پستی
دجلے کی ہر اک موج میں رقصاں ہے ہمالا

کفّار کے دل اور مرے چند سپاہی
اعدا کے پرے، اور مرا ایک رسالا

[۱] حضرت آزاد انصاری

ترے بغیر

جلد آ، کہ زندگی ہے پریشاں ترے بغیر
اب زہر ہے یہ چشمۂ حیواں ترے بغیر

مضطر ہے رُوحِ لالہ و نسریں ترے لئے
برہم ہے زلفِ سنبل و ریحاں ترے بغیر

جس کا ہر ایک شعبہ تھا گُل بانگِ صد نشاط
شیون ہے اب وہ لحنِ ہزاراں ترے بغیر

چھٹتی ہے نبضِ سیرِ چمن تیری یاد میں
ڈستا ہے ابرِ کوہ و بیاباں ترے بغیر

پھیکا ہے رنگِ لالہ و گل تیرے ہجر میں
گونگے ہیں، طائرانِ خوش الحاں ترے بغیر

دامن ہے پارہ پارہ نہ ڈھونڈیں چمن چمن!
کیا کیا بہار سے ہوں پشیماں ترے بغیر

جلد آ، کہ شوقِ دید میں لیلائے زندگی
بھولی ہوئی ہے جنبشِ مژگاں ترے بغیر

اے فتنۂ زمانۂ آشوبِ روزگار
سُونی پڑی ہے انجمنِ جاں ترے بغیر

لرزاں تھی جس کے پنجۂ وحشت سے کائنات
اب وہ جنوں ہے سر بہ گریباں ترے بغیر

اک اشکِ غم ہے تری جدائی میں نجمِ صبح
اک شامِ غم ہے صبحِ بہاراں ترے بغیر

اک زخمِ دشنہ ہے تری فرقت میں بوئے گل
اک داغِ تازہ ہے مہِ تاباں ترے بغیر

اے دخترِ ترنم و اے بنتِ ابر و باد
کیونکر کٹے گا موسمِ باراں ترے بغیر؟

کب آئیگا؟

بالینِ غم پہ عیسیٔ دوراں کب آئیگا
معبود، وہ پیمبرِ درماں کب آئے گا

دِل تنگ ہوں حیات کے اِس دورِ فتنہ سے
یارب مرا وہ فتنۂ دوراں کب آئے گا

جس پر ہزار بار فدا جانِ میزباں
اے گردشِ زمانہ وہ مہماں کب آئے گا

چھانے لگی ہے زیست پہ تاریکیٔ اجل
آخر پیامِ چشمۂ حیواں کب آئے گا

بول اے دیارِ شوق کی پُر ہول خامشی
وہ مستِ ناز و یارِ غزلخواں کب آئے گا

تکلیفِ ہوش آتشِ دوزخ سے کم نہیں
وہ خُم بدوش و میکدہ ساماں کب آئے گا

مدت ہوئی کہ سلطنتِ جاں ہے بےخروش
وہ شہریارِ سلطنتِ جاں کب آئے گا

جن و بشر بتاؤ، زمین و زماں بتاؤ
اپنے گدا کے پاس وہ سلطاں کب آئے گا

جس کے ہر اک نفس پہ چمن کے چمن نثار
یارب ادھر وہ زندہ گلستاں کب آئے گا

میرے دیارِ دوش کی جانب بشکلِ موج
وہ کاروانِ زلفِ پریشاں کب آئے گا

ظلمت نصیب شام کے ایوانِ تیرہ میں
یارو، صفیرِ صبحِ زرافشاں کب آئے گا

اِس اشکبار دیدۂ محروم کے قریب
آنسو جو پونچھتا تھا وہ داماں کب آئے گا

تاریکیوں میں نور کا نکلے گا کب جلوس
پہلوئے شب میں ماہِ درخشاں کب آئے گا

کم ہو چلی ہیں نبضِ تمنا کی گرمیاں
اِس جوئے سُست موج میں طوفاں کب آئے گا

نازاں بہت ہیں دین پہ یارانِ پارسا
اِس شہر میں وہ دشمنِ ایماں کب آئیگا؟

وفادارانِ ازلی کا پیام
شاہنشاہِ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے، اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے "حامیٔ دینِ متیں"
دَورِ سیّد[1] کے "اولی الامر و امیر المومنیں"
اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجئے سلام

[1] سر سید احمد خاں آنجہانی

اِس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یُوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نُطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھُل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اِتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضُور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تَن پر اِک دھجّی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکریہ اُن روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں
روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خُدّام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے؟
آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر، تو کل کھائینگے کیا؟
صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام

کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟

آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامراد
کھاتے جاتا ہے اُسے خدّامِ عالی کا عناد
معدہ محرومِ غذا ہے، کیسہ ہے محرومِ زر
آپ کے عمّال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر
آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اُس بھارت کا سر ہے اور تیغِ احتیاج
ہر جبیں پر ہے شکن، اِس کج کلاہی کی قسم،
ہر مکاں اک مقبرہ ہے، قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج، اے فاتحِ روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں
ہم وفا کیش، آپ کی نظروں سے بھی گر جائینگے؟
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائینگے؟
ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسےٰ ہی کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات

ہم تو موتی بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب!
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ!
ہم وفادارانِ پیشیں ہم غلامانِ کہن
قبر جن کی کھد چکی اٹھ چکا ہے جن کا کفن
تند رَو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈرڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہو اُپنی تلوار کی
آپ سے کیوں کر کہیں ہندوستاں پُرہول ہے

آپ کا نام آگ ہے، اور کانگرس پٹرول ہے
وہ سرنگیں کھُد رہی ہیں، الحفیظ والاماں
صرف انگلستان کیا، یورپ سما جانے جہاں
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عُود کی
ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بُو بارود کی
غور سے سُن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد
آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد
کیجئے درماں میں عجلت، ورنہ دِل ڈر جائینگے
حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے، ہم مر جائیں گے
چونکئے جلدی، ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

شام کا رومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتّی، نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سنّاٹا
مجھے جنبش میں ذرّوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

سُنکتی ہے مزے سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اُٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھلک اٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی، وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پتے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گیرائی فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں، رائیگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ زرّیں میں
مجھے بیتا ہئے عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دریا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی، روشنی کی راز داں معلوم ہوتی ہے

رنیلی[1] ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پہ اک داستاں معلوم ہوتی ہے

[1] ریتیلی: ریتیلی کے عوض مجھے رنیلی زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اہتمامِ غم

آج پھر ہے حریمِ عشرت میں
سرِ شیریں و زانوئے فرہاد

نرم ہے باغ میں نسیمِ شمال
مست ہے آبِ جو پہ بادِ مراد

پھر خرابات میں مہیّا ہے
مئے شیراز و آبِ رکنا باد

بوٹا بوٹا ہے باغ کا سرشار
ذرّہ ذرّہ ہے خاک کا دل شاد

جس طرف جایئے نویدِ طرب
جس طرف دیکھئے مبارک باد

آج دُنیا ہے پھر بہشت بریں
آج دہلی ہے پھر ملیح آباد

مژدہ اے دل کہ پڑنے والی ہو
غم کے اک تازہ قصر کی بنیاد!

یارِ صادق

ہاں یہ غلط ہے بلکہ غلط در غلط ہے جوشؔ ‏ ‏ یعنی مجھے شگفتہ مقدر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ زندگیٔ مستعار میں ‏ ‏ مجھکو خزانۂ زر و گوہر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ مجھکو جوانی کے دور میں ‏ ‏ کوئی قمر جمال و سمن بر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ جوشش مری خوابگاہ کو ‏ ‏ پھولوں کی سیج، عیش کا بستر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ میری محبت کے دور کو ‏ ‏ خود مجھ پہ جو فدا ہو وہ دلبر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ دشت نوردی کے عہد میں ‏ ‏ میرے جنوں کو خضر سا رہبر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ آئینۂ روزگار میں ‏ ‏ مجھکو جمالِ روئے سکندر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ دل کو کسی کی نگاہ سے ‏ ‏ چبھ کر جو ٹوٹ جائے وہ نشتر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ ساقیٔ شیریں کلام سے ‏ ‏ میری زباں کو چشمۂ کوثر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ روزِ ازل کردگار سے ‏ ‏ میرے دل و دماغ کو جوہر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ مجھکو بہ فرمانِ شاعری ‏ ‏ مخلوق سے خطابِ پیمبر نہیں ملا
یہ بھی غلط کہ شہرتِ دائم کے ہات سے ‏ ‏ میری جبیں کو تاجِ گلِ تر نہیں ملا

لیکن خدا گواہ کہ یاروں میں آج تک
سردار روپ سنگھ[1] سے بہتر نہیں ملا

[1] سردار روپ سنگھ دھولپور

آدمی دے، اے خُدا!

اے خُدا، ہندوستاں کو بخش ایسے آدمی
جن کے سَر میں مغز ہو، اور مغز میں تابندگی
جن کی فکرِ تازہ میں، ہو اجتہادی بانکپن
جن کی عقلوں پر نہ ہو بارِ روایاتِ کہن
جن کی رگ رگ میں ہزاروں بجلیاں ہوں بے قرار
جن کے دِل مضبوط ہوں، جن کی امنگیں شعلہ بار
موت کو پوجیں جو عُمرِ جاودانی کی طرح
خُون جو اپنا بہا سکتے ہوں پانی کی طرح
عزم جن کے خندہ زن ہوں ثابت و سیّار پر
ذہن جن کے سانس لیں اوجِ سرِ کہسار پر
جو جئیں تدبیرِ تسخیرِ جہاں کے واسطے
اور مریں بھی تو فقط ہندوستاں کے واسطے
جن کے آگے ہوں گرجتی بدلیاں چنگ و رباب
زندگی کیا، کھیلتا ہو موت سے جن کا شباب

جن کی ہر موجِ نفس میں ہو خروشِ زندگی
جن کا ہر نقشِ قدم ہو اک ستونِ روشنی

جن کے سینوں میں ہوں روشن حُبِّ ملّت کے چراغ
دِل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں دماغ

جن کے بربط میں دہکتی زندگی کا راگ ہو
جن کے دل میں ولولے ہوں، ولولوں میں آگ ہو

جن کی شمعِ فکر ہو روشن تر از مہرِ منیر
سبحہ و زُنّار میں جکڑے نہ ہوں جن کے ضمیر

ناسزا اوہام کر سکتے نہ ہوں جن کا شکار
گائے باجے پر نہ ہو جن کے عقاید کا مدار

اے خُدا ہم کو نزاعِ کفر و ایماں سے بچا!
اپنے ہندو سے بچا، اپنے مُسلماں سے بچا!

رُوح کی رفعت سے ہوں جو آسمانی آدمی
دے ہمیں یارِ خدا "ہندوستانی آدمی"!

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خُدا!
آدمی دے، آدمی دے، آدمی دے اے خُدا!

جھریاں

اِس ضعیفہ کی دیکھئے صورت — کس قدر جھریوں کی ہے کثرت
پوپلا منہ، کریہہ، بدمنظر — صبح جیسے مریض کا بستر
تنگ دھندلی، دھنسی ہوئی آنکھیں — جیسے فرمانِ قتل پر مہریں
حلقے گہرے سیہ بھیانک سے — جیسے اندھے کنوئیں بیاباں کے
چھاؤں پلکوں کی سرد ڈھیلوں پر — جیسے بیمار پر سیہ چادر
دانت دو اِک قریب گرنے کے — بھولے بھٹکے سے راہرو جیسے
کوزہ پشتی سے چال بے تاثیر — جیسے ٹوٹی ہوئی کمان کا تیر
بال سُرخ پر سفید زلفوں کے — ملگجی دھوپ، لاش پر جیسے
مُردہ لہجے کی کپکپی، گویا — ٹوٹی قبروں کے روزنوں میں ہوا
جُھریاں منہ پہ، خال و خد سنساں — جیسے دلدل میں گاڑیوں کے نشاں
جُھریوں میں نہاں ہے اِک دُنیا — یہ نشاں ہیں ریکارڈ[1] کے گویا
جن میں سوئے ہوئے ہیں مُدت سے — کروٹیں لے رہے ہیں حسرت سے

زمزمے عہدِ کامرانی کے
گیت گزری ہوئی جوانی کے

[1] گراموفون کے ریکارڈ۔

نیازِ ناز

لو آگئیں وہ دعوتِ ایماں لئے ہوئے
شانوں پہ کفرِ زلفِ پریشاں لئے ہوئے

رفتار، شاخِ گل کا مٹاتی ہوئی غرور
گفتار، نغمہ ہائے بہاراں لئے ہوئے

آنکھیں، فروغِ جلوۂ رنگیں سے گلفروش
باہیں، جمالِ غنچۂ عریاں لئے ہوئے

تابِ نظر میں روشنیٔ صبحِ زندگی
موجِ نفس میں چشمۂ حیواں لئے ہوئے

بکھرائے مصحفِ رخِ رنگیں پہ کاکلیں
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے

ہر اک قدم پہ گوئے دو عالم سے کھیلتی
گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے

بادِ شمال و ابرِ خراماں و موجِ گل
ہر آب و رنگِ عالمِ امکاں لئے ہوئے

رک جائے جس کو دیکھ کے طغیانیوں کی سانس
آنکھوں میں وہ شباب کا طوفاں لئے ہوئے

دستِ حنا نواز میں باوصفِ نازکی
عشقِ زمانہ سوز کا داماں لئے ہوئے

رخسار میں جلائے ہوئے شمعِ اختلاط
آنکھوں میں التفاتِ فراواں لئے ہوئے

شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے
چشمِ سیہ میں دید کا ارماں لئے ہوئے

چہرے پہ صبحِ عشق و جوانی کی سرخیاں
آنکھوں میں شامِ خوابِ پریشاں لئے ہوئے

جادو بھری نگاہ میں اک داستانِ غم
غم کی جِلو میں شکوۂ دوراں لئے ہوئے

آنکھوں میں عزمِ جامہ دریٔ، امیں خوفِ خلق
پلکوں میں پارہ پارہ گریباں لئے ہوئے

ژولیدگیٔ کاکلِ عنبر سرشت میں
شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں لئے ہوئے

لہجے میں، چوٹ کھائے ہوئے دل کی کروٹیں
آواز میں، خراشِ رگِ جاں لئے ہوئے

خود دوش پر اٹھائے ہوئے کائناتِ درد
ہر دردِ کائنات کا درماں لئے ہوئے

نازِ جمالِ یار ہے حرفِ غمِ نیاز
اُٹھ جوشؔ، اُٹھ متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

ساون کے مہینے

فردوس بنانے مرے ساون کے[ل] مہینے
اک گل رخ و نسریں بدن سروِ سہی نے

ماتھے پہ اِدھر کاکلِ ژولیدہ کی لہریں
گردوں پہ اُدھر ابرِ خراماں کے سفینے

مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار
اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے

اللہ رے یہ فرمان کہ اس مست ہوا میں
ہم منہ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے

وہ مونس و غم خوار تھا جس کے لئے برسوں
مانگی تھیں دعائیں مرے آغوشِ تہی نے

گل ریز تھے ساحل کے لچکتے ہوئے پودے
گلرنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے

بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود
جس طرح مئے ناب سے دُھل جاتے ہیں کینے

دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر سرد ہوائیں
آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے

بھر دی تھی چٹانوں میں بھی غنچوں کی سی نرمی
اک فتنۂ کونین کی نازک بدنی نے

گیتی سے اُبلتے تھے تمنا کے سلیقے
گردوں سے برستے تھے محبت کے قرینے

کیا دل کی تمناؤں کو مروڑا کیا تھا
سبزے پہ مچلتی ہوئی ساون کی جھڑی نے

بدلی تھی فلک پر، کہ جنوں خیز جوانی
بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے

شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہوئے شہپر
لہروں میں بطیں اپنے ابھارے ہوئے سینے

اس فصل میں اس درجہ رہا ہے خود و سرشار
مے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آوازِ حیاتِ ابدی نے!!

ل موسم باراں سے مراد ہے۔

حُبِّ وطن اور مسلمان!

ظرف اور اس حد کا تنگ اے حامیٔ دینِ مُبیں
حیف اے ناآشنائے "رحمۃ للعالمین"!

اختلافِ مذہب وملت پر اور اتنا جلال!
بھائیوں کے خونِ ناحق کو سمجھتا ہے حلال!
حیف اے دیوار کے پابند، اے در کے اسیر
اپنے جرگے، اپنے گنبد، اپنے منبر کے اسیر

دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا
کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا
چھین لیتا ہے جو لطفِ باہمی کے قہقہے
قلب میں پھنکارنے لگتے ہیں جس سے اژدہے
مذہبی اخلاق کے جذبے کو ٹھکراتا ہے جو
آدمی کو آدمی کا گوشت کھلواتا ہے جو

مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصّب کا گلہ؟
مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا؟
تنگ فکر و تنگ داماں تنگ ظرف و تنگ جیب
مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے، اور زندہ عیب
فرض بھی کر لوں کہ ہندو، ہند کی رسوائی ہے
لیکن اس کو کیا کروں، پھر بھی وہ میرا بھائی ہے!
مرد اگر ہوں، بھائیوں کا خون پی سکتا نہیں
بھائیوں کا خون اگر پی لوں تو جی سکتا نہیں!
باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے
بھائیوں کا ہاتھ تر ہو بھائیوں کے خون سے!
سبحۂ و زنّار کی لہروں ہی پر بہتا ہے تو
اور اس تنگی پہ مجھ کو کم نظر کہتا ہے تو!
تیری ہستی تنگنائے کفر و ایماں کے لئے
میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لئے!
گونجتی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری

کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری!
لیکن اس کے ساتھ ہی اے مبتلائے کفر و دیں

دولتِ حُبِّ وطن کو چھوڑ دوں، ممکن نہیں
حصّہ ہے سب سے مقدم زندگی میں "خویش" کا

"خویش" سے بچ جائے تو پھر مال ہے "درویش" کا!
سعی کرنا چاہیئے پہلے تو گھر کے واسطے

گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے

تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!

کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں؟
کُل جہاں تیرا، مگر ہندوستاں تیرا نہیں!!

مردِ حق کو قعرِ باطل سے اُبھرنا چاہیئے
کعبۂ حُبِّ وطن میں سجدہ کرنا چاہیئے!!

سب سے پہلے مردبن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

تصویرِ جمال

لہراتی تھیں زلفیں کھل کھل کر اس شان سے رنگیں شانوں پر
جس طرح گھٹائیں ساون کی جھک پڑتی ہیں میخانوں پر
شانوں سے کمر پہ گرتے تھے یوں بال کہ دھوکا ہوتا تھا
پیغامِ رحمت آیا ہے، درگاہِ الٰہی سے گویا
ہونٹوں پہ دھیمے نغمے تھے یا محو تھیں حوریں قرات میں
مکھڑے پہ لٹوں کا پرتو تھا، یا آبِ حیواں ظلمت میں
بات، شکر کی بارشِ پیہم، چال، گلوں پہ رشحۂ شبنم
مست نظر تھی خنجر و مرہم، لعلِ لب میں اسمِ اعظم
ہر تارِ نظر میں غلطیدہ، پُر سوز دلوں کی سرد آہیں
مکھڑا روشن، رنگ شہابی، کالی زلفیں، گوری باہیں
چلتی تو قدم یوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں
یا ناز سے بھیگی راتوں میں شبنم کے قطرے گرتے ہیں

تاریک شبوں کا مجموعہ بھونروں کی عبادتگہ جوڑا

پُتلی تھی چشمِ آہو کی، یا قلب سیہ تھا زاہد کا

مُردوں کو جِلا دینے والا یُوں نُور تھا چشمِ تاباں میں

عزمِ "کُن" کا لمحۂ اوّل جیسے ضمیرِ یزداں میں

آنکھوں میں شبابِ طفلی کی اک جام سے باہم مے نوشی

آدم و حوّا کی جیسے فردوس میں پہلی سرگوشی

زُلف پہ ٹیکے کی لڑیاں، دعوت جی کے کھونے کی

جس طرح کسوٹی پر جھلکیں زرتار لکیریں سونے کی

تاروں کا پرتو پڑتا تھا، یوں عارض کے آئینے میں

جس طرح شبِ مہ ساحل پر، یا دھی کے تھرے سینے میں

شاعر و خدا

اے امیرِ ہردو عالم، اے دبیرِ کائنات
تیرے شاعر پر ہے کب سے تنگ میدانِ حیات

صرف عسرت ہی نہیں مجھ پر چھری پھیرے ہوئے
رہتی ہیں بیماریاں بھی گھر مرا گھیرے ہوئے

کس طرح حاصل ہو میری جان کو صبر و قرار
میں کہ ہوں سولہ برس سے مستقل تیماردار

ہے شریکِ زندگی مجھ ناتواں کی وہ غریب
اک نفس کی تندرستی بھی نہیں جس کو نصیب

اختلاجِ قلب کا اور پھر رہے دائم شکار
وہ رفیقِ زندگی جس پر ہو جینے کا مدار

جنگ بھی جس کی ہے پیکِ آشتی میرے لئے
ہر نفس جس کا ہے لحنِ زندگی میرے لئے

ہر قدم پر زندگی کا درس دیتی ہے مجھے
جو ہر اک ٹھوکر پہ بڑھ کر روک لیتی ہے مجھے

ناروا آلام سے اور اُس کی حالت ہو تباہ
جس کا ہر نقشِ قدم ہے میرے دل کی سجدہ گاہ

ہر مرض موجود ہے لیکن دوا کچھ بھی نہیں
دستِ خالی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

چرخ پر آتی ہیں جب کالی گھٹائیں ناز سے
کیا کہوں کس طرح بل کھاتے ہیں دل میں ولولے

جب کبھی دیتا ہے موسم دعوتِ سیر و سفر
بے بسی سے رُوح رہ جاتی ہے میری کانپ کر

بے کسی میں کس طرح دیکھے یہ عبدِ خاکسار
تیرے صحرا، تیرے کوہ و دشت، تیرے آبشار

قطرہ قطرہ کر کے دیتی ہے مجھے دنیا شراب جیسے ہیں تاروں کے یاں ہوتا ہے طالع آفتاب

سیم و زر سے بے زروں کی جیب بھر سکتا نہیں

بے کسوں کی بھی تو کچھ امداد کر سکتا نہیں

کیوں یہ شکوے یہ گلے اے شاعرِ رنگیں نوا اس قدر کفرانِ نعمت آفریں و مرحبا

وارثِ کونین ہو کر یہ شکایت یہ کلام کر چکا ہوتا نہ تجھ پر کاش میں دوزخ حرام

خندۂ روحِ دو عالم جلوۂ لیل و نہار کیا تری چشمِ تصور پر نہیں ہے آشکار

آبشار و کوہ و دشت و گلشن و ارض و سما خود ترے دربار میں حاضر نہیں ہوتے ہیں کیا؟

کیا ترے آغوش میں سیلابِ بیداری نہیں

کیا ترا امرِ شعر اس کونین پر بھاری نہیں

سیم و زر میں دفن ہو جائیں گے اربابِ دل تیرے دامن تک نہ آئیگا کبھی دستِ اجل

کیا خبر بھی ہے تجھے اے شاعرِ شیریں مقال دوسروں کو سیم و زر بخشا ہے اور تجھکو خیال

وہ خیالِ صاعقہ بر دوش و طوفاں در بغل جس سے بنتے ہیں عناصر جس سے ڈرتی ہے اجل

جو بدل سکتا ہے پل بھر میں نظامِ ہست و بود بخشتا ہے جو عدم کے جسم کو روحِ وجود

جو ہے تنہا کاتبِ دیوانِ بزمِ ممکنات قوتِ کونین سازِ و خالقِ ذات و صفات

مستقل اِک جنبشِ صد بال و پر ہے جو خیال عزمِ تسخیرِ قوائے بحر و بر ہے جو خیال

وہ خیالِ مرگ افگن، وہ خیالِ ذی حیات
جو الٰہِ دہر ہے، پروردگارِ کائنات

عالمِ محسوس میں پیغمبری کرتا ہے جو
اور اُس سے بھی بڑھے تو داوری کرتا ہے جو

ہندیوں کا سازِ دل، خاموش ہے جس کے بغیر
ایشیا کا سر، وبالِ دوش ہے جس کے بغیر

ہو کے محرم زندگی کے خواب کی تعبیر کا
شکوہ مجھ سے کر رہا ہے گردشِ تقدیر کا!!

شکر کر گھر میں ترے تابندہ ہے شمعِ حیات
بیشتر بیماریاں ہوتی ہیں صحت کی زکوٰۃ

شکوہ کرتا ہے تو اچھا لے یہ دُنیا ہے، یہ دیں
مجھ کو واپس کر دے اپنی فکر کا تاجِ نگیں

سر بسر مایوس ہو جا دولتِ الہام سے
نوعروسِ معرفت کے نامہ و پیغام سے

اپنے امواجِ تفکر کا ترنم پھیر دے
ذہن کے لہلہائے رنگیں کا تبسم پھیر دے

تجھ سا خوش تقدیر اپنے کو کہے آشفتہ بخت
اپنا جوہر مجھ کو دے ڈے اور لے لے تاج و تخت

یہ متاعِ سیم و زر ہے، ختم کر گفت و شنید
بند کر لب، پھینک دے دل کے خزانے کی کلید

قطع کر لے فطرتِ روح الامیں سے اتصال
جمع کر دے میرے لافانی خزانے میں خیال

دیکھ یہ جنسِ زمیں ہے، یہ متاعِ آسماں
چھوڑ دے دستِ تخیل سے تجلی کی عناں

لے یہ صورت کا ستارہ ہے یہ دولت کا چراغ
پھیر دے دل، پھوڑ لے چشمِ سخن، رکھ دے دماغ

کیا یہی تیری تجارت ہے خدائے بے نیاز؟
دے رہا ہے سیم و زر اور لے رہا ہے سوز و ساز؟

اے خدائے عقل میں مجنون ہوں تو ہوشیار
ہو نہیں سکتا ہے مجھ سے اور تجھ سے کاروبار

مفت بھی تو سیم و زر بخشے تو لے سکتا نہیں
اپنا جوہر میں کسی قیمت پہ دے سکتا نہیں

المحذر! مل جائے دولت اور گم ہو جائے جوش
واہ کیا کہنا ترا، اے تاجرِ ارزاں فروش

شاعرانہ شکوہ سنجی سے مری بارِ خدا!
واقعی تو کیا اُٹھانا چاہتا ہے فائدہ

چند ذرّوں کے لئے کون آسماں دیدوں گا میں؟
تیرے کانٹے لے کے اپنا بوستاں دیدوں گا میں:

درحدیثِ دیگراں

کل بارگہ ناز میں بیٹھے یہ کیا عرض
بلبل طلبِ گل میں ہے اک عمر سے مضطر

کیسا یہ ستم ہے کہ کسی عہد میں ابتک
بلبل کی صداؤں سے پسیجا نہ گلِ تر

یہ سنتے ہی پیدا ہوئی رخسار پہ سرخی
کچھ شرم کے آثار، تو کچھ غیظ کے تیور

سُرخی سی جھلکنے لگی اک دھوپ سی ناگاہ
وہ دھوپ چمکتی ہے جو تتلی کے پروں پر

رقیق لَے

یہ کس نے آج سایۂ ابرِ بہار میں
بھر دیں دلِ شکستہ کی ضربیں ستار میں

ہر تار میں تلاطمِ درد و خروشِ آہ
آہن میں ہے وہ لوچ کہ اللہ کی پناہ

چھاتی دھڑک رہی ہے تو آنکھیں ہیں اشکبار
گویا بجا رہا ہے کوئی آنسوؤں کے تار

ہر زمزمہ تان، روح سے پیوست و متصل
ہر زمزمے میں ایک دھڑکتا ہوا سا دل

میزانِ کشمکش میں ترانے تُلے ہوئے
فطرت سرائے دل کے دریچے کھلے ہوئے

ہر شعبۂ صدا خمِ گیسو لیے ہوئے
ہر لَے کا لوچ، خون کے آنسو لیے ہوئے

گویا جنوں کی تیز سواری اُتار پر
رُوحوں کا رقص تیغِ محبت کی دھار پر

ضَوسی، کتابِ عشق کے ہر ایک حرف پر
تانوں کی دھوپ، عمرِ گذشتہ کی برف پر

ہر تال یوں رقیق ہے جس طرح موجِ مے
کیسے کوئی بتائے، ہے کیونکر ہر ایک لَے

اُتری، چڑھی، تڑپ کے گری، مُڑ کے پھر گئی
پھرتے ہی میرے دل کے سمندر میں گر گئی

پیٹ بڑا بدکار

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
شیرِ ببر اور نیولے کی گردن میں ڈالے ہار
اژدر کے اور ہوش اُڑا دے چوہے کا دربار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
دولت کے آگے سر ٹیکیں بڑے بڑے گمبھیر
زر کے آگے بھاؤ بتائیں بڑے بڑے سردار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

سُورج کو پروانہ بنادے، ذرّوں کی قندیل
شہباز کو اپنی دُھن پہ نچائے کوّدں کا تہوار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

فاضل کا اور رنگ اُڑادے جاہل دولت مند
ہاتی کا، اور خون بہادے چیونٹی کی تلوار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

بھولے بھالے رشیوں کو سازش کے سکھائے ڈھنگ
اچھے اچھے ویروں کو چوری پہ کرے طیار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

یہ نظم بحر سے بے نیاز ہو کر لہر میں یا کہی گئی ہے۔

ناداں بیٹھے کشتی میں اور دانا غوطے کھائے
کُتا سوئے گدّے پر اور ٹہلے چوکیدار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

بھینس کے آگے بین بجائیں نئے سُر کے اُستاد
بُت کے آگے سیس نوائیں دھرتی کے اوتار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

کوؤں کو اور راگ سُنائے کوئل بن کے بیچ
مُنعم کی اور سیج بسائے مفلس کا دلدار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

آدم کا بانکا بیسٹا اور بھڑوے پن کا روپ
حوّا کی سندر بیٹی اور رنڈی کا بیوہار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

سوامی فاقوں سے تنگ آ کر تج دے اپنا دیس
گھر کی چوکھٹ پہ گھر والی روئے زار قطار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

لوہا ڈر سے گر گر کانپے، پتھر تھر تھر ہوئے
مایا کی اے تیز کٹاری بل بے تیری دھار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

پھول چمن کے، مولی بیچیں، شاخیں ٹھیکیں دھان
شاعر اور فنکر دُنیا، عاشق اور بیوپار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
شیر کے منہ میں سر دیدے اور ناگ کے بل میں ہاتھ
پیٹ بڑا نا پاپی ہے، اِس پاپی سے ہشیار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

بُوڑھا شوہر

ہر سانس ہے اِس حلقۂ سوزاں میں جلاپا
اِک قہر ہے، اک قہر ہے، اک قہر سراپا
تولا کبھی بجلی نے، کبھی آگ نے ناپا
یہ چیز ہے واللہ سہاگن کا رنڈاپا
کمسن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

بھولے سے بھی جس وقت ذرا آنکھ اٹھائی
منہ پوپلا، بگڑی ہوئی صورت نظر آئی
دی تازہ تمنّاؤں نے گھبرا کے دہائی
ہونے لگی تقدیر و جوانی میں لڑائی
کمسن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

چبھتا ہوا اک تیر ہے بالوں کی سفیدی
چہرے پہ ہے کمزور بصارت کی اُداسی
بُو آتی ہے ہر سانس سے کافور و کفن کی
اور ایسے کے آغوش میں بھرپور جوانی
کم سن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی
مہندی کفِ رنگیں میں لگائی نہیں جاتی
آئینے کو صورت بھی دکھائی نہیں جاتی
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائی نہیں جاتی

کم سن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

رشتہ نہیں جڑتا ہے مگر جوڑ رہی ہے
تقدیر کی دہلیز پہ سر پھوڑ رہی ہے
تمکین کی ہاتوں سے عناں چھوڑ رہی ہے
کمبخت تمنّا ہے کہ دم توڑ رہی ہے

کم سن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

اک رات بھی کمبخت سہانی نہیں آتی
نیند آنے کو کوئی ایسی کہانی نہیں آتی
وحشت میں کوئی بات بنانی نہیں آتی
قابو میں کسی طرح جوانی نہیں آتی

کم سن کے لئے موت ہے شوہر کا بڑھاپا

ضبطِ گریہ

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو، کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے، اور آفتاب پیدا کر

مسلکِ جوشؔ

کیا تجھ کو ہے یہ وہم کہ دشمن ہے ترا جوشؔ؟
افسوس کہ تو واقفِ اسرار نہیں ہے
آگاہ ہو آگاہ کہ اِس جوشؔ کے دِل میں
بیہودگیٔ اندک و بسیار نہیں ہے
واللہ کہ یہ جوشؔ، خرابات نشیں جوش
منجملۂ زُہّادِ ریاکار نہیں ہے
وہ نشۂ صہبا کا ہے چڑھتا ہوا پارہ
ہاں زہد کی گرتی ہوئی دیوار نہیں ہے
ہو، اُس میں جو ہے ابر کی مستانہ خرامی
رکتی ہوئی نبضوں کی تو رفتار نہیں ہے
ہاں ہاں وہ نظرباز و قدح خوار ہے یعنی
توفیقِ الٰہی کا گنہ گار نہیں ہے!

اِس آدمِ خاکی کے ہوا خواہ کے دل کو
جُز مہر و وفا اور کچھ آزار نہیں ہے!
ہاں اس کو مُبارک ہو غم و غیظ و عداوت
جو زُلفِ محبت کا گرفتار نہیں ہے!
دُشنام و ملامت کا تو کیا ذکر کہ یہ شخص
یاروں کی شکایت پہ بھی تیار نہیں ہے!
اس خلوتیٔ شاہدِ توحید کے دل میں
آشفتگیٔ سبحہ و زُنار نہیں ہے!
اِس واقفِ اضداد کی دنیائے نظر میں
بیہودگیٔ کافر و دیندار نہیں ہے!
ہاں اُس کا یہ ایماں ہے کہ اِس باغِ جہاں میں
ہر خار و خس اِک گُل ہے کوئی خار نہیں ہے!
اِس شخص کے سینے میں ہیں بیگانے بھی داخل
یہ صرف یگانوں ہی کا غمخوار نہیں ہے!
ہاں خانۂ دشمن کی بھی جاروب کشی میں

واللہ کہ اِس شخص کو کچھ عار نہیں ہے!

اِس واقفِ ماحول و وراثت کی نظر میں
قاتل بھی ملامت کا سزاوار نہیں ہے!

آوازہ دو آواز کہ یہ رندِ قدح خوار
کیا دوست کہ دشمن سے بھی بیزار نہیں ہے!

اِس محرمِ خودداریٔ عشاق کے نزدیک
ابلیس بھی مردود و گنہگار نہیں ہے!

رکھے گا وہ، اور تجھ سے عداوت کا تعلّق؟
کونین سے کچھ جس کو سروکار نہیں ہے!

خود جنسِ دو عالم ہو تو ہو اُس کی خریدار
وہ جنسِ دو عالم کا خریدار نہیں ہے!

دردِ محبّت

ہمنشیں، دردِ محبت، مجھے معلوم نہ تھا
اِتنی ہوتی ہے اذیّت، مجھے معلوم نہ تھا

عشق کی وادیٔ حیرت میں قدم رکھتے ہی
خود سے ہو جاتی ہے وحشت، مجھے معلوم نہ تھا

کہتے ہیں اہلِ جہاں عشقِ مجازی جس کو
وہ بھی ہے عینِ حقیقت، مجھے معلوم نہ تھا

دل جب آتا ہے تو دنیا کے کسی گوشے میں
نہیں لگتی ہے طبیعت، مجھے معلوم نہ تھا

زندگانی کے ستائے ہوئے انساں کیلئے
موت ہے آیۂ رحمت، مجھے معلوم نہ تھا

وصل کہکر جسے دل شاد کیا کرتے ہیں
اصل میں وہ بھی ہے فرقت، مجھے معلوم نہ تھا

حسن خود بڑھکے کلیجے سے لگالے سو بار
پھر بھی ملتی نہیں راحت، مجھے معلوم نہ تھا

عشق میں بسترِ سنجاب ہو یا تختۂ گل
نیند آتی ہے بدقّت، مجھے معلوم نہ تھا

جس کو بھٹکا ہوا انسان خوشی کہتا ہے
وہ بھی ہے غم کی امانت، مجھے معلوم نہ تھا

پہلوئے یار میں بھی خوش نہیں ہونے دیگی
اِتنی ظالم ہے مشیّت، مجھے معلوم نہ تھا

لو گرفتارِ غمِ ہجر کے حق میں اے جوشؔ
رات ہوتی ہے قیامت، مجھے معلوم نہ تھا

نوجوان سے خطاب

اٹھ، اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر

عقولِ مُردہ و مرطوبِ نوعِ انساں میں
شرار و شعلہ و دود و دُو بخار پیدا کر

مٹا دے سلسلۂ آلِ خلد و نسلِ جحیم
اُٹھ، اور ملتِ حکمت شعار پیدا کر

ضمیرِ اہلِ مناجات کے تعطل میں
خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار پیدا کر

نئے اصولِ سزا و جزا کی تعلیم
نیا تخیلِ روزِ شمار پیدا کر

نظامِ کہنۂ نیلی رواق، اوہام و فریب
نیا تصورِ لیل و نہار پیدا کر

غلط ہے، سازِ عجم ہو کہ لحنِ اعرابی
نیا ترانۂ سرِ شاخسار پیدا کر

بہت بلند ہے سطحِ مذاقِ فکرِ جدید
نظر میں اوجِ سرِ کوہسار پیدا کر

جمی ہوئی ہے دماغوں پہ برف مدت سے
دلوں میں دولتِ برق و شرار پیدا کر

فسردہ گامیٔ اہلِ جہاں کے حلقے میں
جواں خرامیٔ ابرِ بہار پیدا کر

کلاہِ خواجگیٔ کائنات کج کر کے
نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر

الٰہ دہر ہے تو، یہ گدائیاں تا چند؟
نظر میں سطوتِ صد شہریار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر

مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

انتظار کے دِن

صبا ادب سے یہ کہنا کہ ہیں بہار کے دن
شرابِ سُرخ کی راتیں ہیں، لالہ زار کے دِن

زمانہ رقص میں ہے، روزگار نغمہ سرا
مگر خموش ہیں اِس تیرہ روزگار کے دن

تِرے خیال میں گریاں ہیں، تیری یاد میں گُم
یہ ماہتاب کی راتیں یہ آبشار کے دن

فرازِ کوہ سے پھوٹے ہیں نو بنو چشمے
پھریں گے اب بھی نہ کیا چشمِ اشکبار کے دِن

تجھے خبر ہو تو کیوں کر کہ کن بلاؤں میں ہیں؟
گزر رہے ہیں تِرے شاعرِ بہار کے دِن

خدا گواہ کہ کاٹے سے اب نہیں کٹتیں
یہ انتظار کی راتیں یہ انتظار کے دِن

محرومِ تمغہ

سُنا ہے چیف کمشنر کا شام کو دربار
لئے ہوئے تھا شکوہِ خدیو و صولتِ جم
اِدھر غلام تھے اُس سمت حاکمِ جبّار
اِدھر مریض تھے، اُس سمت عیسیٔ مریم
اِدھر فنا کی اُداسی، اُدھر بقا کی بہار
اِدھر حدوث کا شیون، اُدھر خروشِ قدم
اُدھر تھے بخت سے دلدادگانِ لچھمن و رام
اِدھر تھے خیر سے وابستگانِ خیرِ اُمم
اُدھر تھا قلعۂ شاہی، جوابِ گورستان[1]
اِدھر تھا قصرِ فرنگی مثالِ باغِ ارم
وہ لوگ جن کے اَب وجد تھے قلعہ گیر و دلیر
کھڑے ہوئے تھے بہ اندازِ دخترانِ حرم

[1] بعض حالتوں میں عطف و اضافت کے ساتھ "ن" اعلان کو میں جائز سمجھتا ہوں۔

ہر اک ادا سے یہ آتی تھی پے بہ پے آواز
"ہمیں نہ چھیڑنا، دیکھو تمہیں خدا کی قسم"
لرز رہی تھی غرورِ فرنگ کے آگے
وہ قوم، تھی جو کبھی رازدارِ سیف و قلم
جوارِ شاہ میں ہر شخص تھا شگفتہ و شاد
عطائے تمغہ سے ہر فرد تھا خوش و خرم
اگرچہ ہیبتِ شاہی سے نطق تھے بے کار
ہر ایک چہرہ مگر کہہ رہا تھا یہ پیہم
"کہ حکم اگر ہو تو ادنٰے سے اک اشارے پر
تمام قوم کے دم بھر میں سر اڑا دیں ہم"
"تمام قوم ہے کیا چیز اے شرِ ذی جاہ
فدائے طرۂ تاجِ تو مادر و پدرم"
ہر ایک چیز تھی القصہ زیب و زین میں غرق
سوائے کاکلِ حبِّ وطن، کہ تھی برہم
وطن کے حق میں ہوائیں ہیں جس کی بادِ سموم
فضا میں شان سے لہرا رہا تھا وہ پرچم

بقدرِ سعیٔ برادر کُشی و بغضِ وطن
برس رہا تھا ہر اک کے چمن پر ابرِ کرم
رہیں کیف و طرب تھے تمام درباری
سوائے حضرتِ "فاضل"[1] کہ تھے اسیرِ الم
کہا کسی نے کہ حضرت مزاج کیسا ہے؟
یہ کس ملال سے رُخِ زرد، اور چشم ہے نم؟
یہ سُن کے حضرتِ "فاضل" نے آہ بھر کے کہا
ہنسائے جائیں حریف اور رلائے جائیں ہم
خبر بھی ہے کہ بہ تقریبِ تاج پوشیٔ شاہ
مری غذا نے بھرے تھے گداگروں کے شکم
بس ایک بار غریبوں پہ رحم آیا تھا
سو وہ بھی از پئے خوشنودیٔ شہِ اکرم
عطا ہوں دوسروں کو تمغہ ہائے خوشنودی
ہماری سمت نہ لیکن پھرے نگاہِ کرم
جگر نہ خون ہو کس طرح اس تماشے سے "کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم"

[1] اصلی نام مخفی رکھا گیا ہے

دعوتِ امتحاں

دلِ سخن کی قسم، روحِ شعر کی سوگند
کہ آج مجھ سا نہیں مردِ نادرہ گفتار

وہ روح سوئی ہوئی ہے جو بزمِ عالم میں
مرے دماغ کے خلوت کدے میں ہے بیدار

نقاب اٹھا کے ہر اک صبح رقص کرتی ہے
مرے ضمیر کی مسند پہ لیلیٔ اسرار

نگار خانۂ گیتی، مرے کلام کا صید
طلسم خانۂ گردوں مرے سخن کا شکار

زمینِ شعر ہے مجھ سے، فلک بدوش، چمن
دیارِ نطق ہے مجھ سے، جناں بکف گل زار

طلوع ہوگا جو، اب سے ہزار سال کے بعد
وہ آفتاب ہے میری نگاہ میں ضو بار

ہر ایک لفظ مرا ذی شعور و نغمہ طراز
ہر ایک حرف مرا ذی حیات و زمزمہ بار

ندیمِ چشم ہے، ارض و سما کی جلوہ گری
رفیقِ گوش ہیں، کونین کے لبِ گفتار

فرازِ شعر پہ، میرے سخن کی قوسِ قزح
کہ دوشِ طفلِ برہمن پہ جلوۂ زنّار

کنارِ بحر میں جس شان سے منارۂ نور
جبینِ وقت پہ رخشاں ہیں یوں مرے اشعار

مرے حضور، عناصر ہیں حاجب و درباں
مری جناب میں روح الامیں عصا بردار

زہر ہنر کہ زنم لاف، امتحاں شرط است
"بیا زما و مکن پیش ازامتحاں انکار

"بلے کلیم و کاذب نبوّتم اگو نیل؟
"بلے خلیلم و نا پختہ دعوتم!! کو نار؟"

(غالب)

عِلم کی تشنگی

دولتِ دُنیا؟ نہیں، آسائشِ عقبےٰ؟ نہیں
اتنی پستی، کم سے کم، میرے لئے زیبا نہیں
عرصۂ عشرت، نہایت تنگ ہے میرے لئے
خواہشِ دنیا و عقبیٰ ننگ ہے میرے لئے
نعمتِ حُور و طُہور و دولتِ تاج و سریر؟
ہو نہیں سکتے ہیں میرے ولولے اتنے حقیر
اِس زمیں کو، اور خطابِ "نعمتِ بسیار" دوں؟
آسماں بھی سامنے آئے تو ٹھوکر مار دوں
اپنی چوکھٹ پر جھکاؤں صرف گردوں کی جبیں؟
اِس تصوّر کو بھی میں برداشت کر سکتا نہیں
کیا؟ مرا نقشِ قدم ہو، اور جبینِ آفتاب!!
اِس قدر ادنیٰ نہیں میری تمناؤں کے خواب

اُڑ سکوں عرشِ بریں پر، اور سمندر پہ چلوں
میں ہوں شاعر اِس قدر اوچھی تمنا کیوں کروں؟
"لے یہ دُنیا کے خزانے ہیں، یہ نقد و جنسِ دیں"!
اے خدا! شاعر سے یہ کہنا تجھے زیبا نہیں
مجھ کو تو پیغمبری دے، اور نہ شاہنشاہ کر
بن پڑے تو سرِ موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی اک جہلِ مطلق ہے "خدا" کر دے مجھے

موجِ باراں

یہ رنگِ چمن، یہ ابرِ بہاراں — بادہ گساراں! بادہ گساراں!

موجِ باراں — موجِ باراں

بادہ گساراں! — بادہ گساراں!!

گونجے گونجے، کُنج میں گونجے — لحنِ حریفاں، صوتِ ہزاراں

موجِ باراں — موجِ باراں

بادہ گساراں! — بادہ گساراں!!

چمکے، چمکے، ناز سے چمکے — برقِ تاباں، روئے نگاراں

موجِ باراں — موجِ باراں

بادہ گساراں! — بادہ گساراں!!

مچلے، مچلے، رُوح میں مچلے — نغمۂ خوباں، خندۂ یاراں

موجِ باراں — موجِ باراں

بادہ گساراں! — بادہ گساراں!!

بہکیں بہکیں، شوق سے بہکیں
موجِ باراں
بادہ گساراں!

شرع فریباں، توبہ شکاراں
موجِ باراں
بادہ گساراں!!

کھولیں، رُخ پر زلفیں کھولیں
موجِ باراں
بادہ گساراں!

ماہ نشیناں، مہر سواراں
موجِ باراں
بادہ گساراں!!

کھیلے، کھیلے باغ میں کھیلے
موجِ باراں
بادہ گساراں!

لرزشِ مے سے موجِ باراں
موجِ باراں
بادہ گساراں!!

امروزِ بے فردا

موت کے آغوش میں جینے کا ساماں کیا کروں
کیا کروں اے پیچ و تابِ شامِ ہجراں کیا کروں

اب نہ نقدِ عافیت باقی، نہ توقیرِ حیات
اب خیالِ دزد و خوفِ دشمنِ جاں کیا کروں

دل سے تا ذرّات و انجم کوئی شے ساکن نہیں
کیا کروں اے گردشِ گردونِ گرداں کیا کروں

بھاگتی ہیں راحتیں مجھ سے جدھر جاتا ہوں میں
اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں

سر میں اک سودا سا ہے اور وہ بھی سودا عشق کا
دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی عریاں کیا کروں

ہو چکا ہے فکرِ ننگ و نام سے فارغ دماغ
اب یہ دامن کیا کروں، اب یہ گریباں کیا کروں

زندگی میں جب کوئی امروز ہی باقی نہیں
کاوشِ فردا سے دل کو اب پشیماں کیا کروں

آندھیاں ایسی چلیں، گُل ہو گئی شمعِ مراد
اب چراغِ زندگی کو زیرِ داماں کیا کروں

چاندنی ہے، باغ ہے، صہبا ہے لیکن وہ نہیں
اے صبا کیونکر جیوں، اے ماہِ تاباں کیا کروں

ہائے وہ ناشستہ جلوے، ہائے وہ انگڑائیاں
ہم نشیں اب مقدمِ صبحِ درخشاں کیا کروں

دیکھتی تھی نبضِ موسم جن کے ڈوروں میں نگاہ
ہائے وہ آنکھیں میں اب سیرِ بہاراں کیا کروں

یہ جُدائی، اور یہ راتیں بھری برسات کی
چُبھ رہی ہے پہلوؤں میں موجِ باراں کیا کروں

ہائے وہ شمشادِ رقصاں، ہائے وہ سروِ رواں
جوشؔ اب نظّارۂ ابرِ خراماں کیا کروں

شاعر کا ایثار

تجھے خبر بھی ہے ہندوستاں! کہ تیرے لئے
عمل پسند ہے غفلت شعار تھا جو شخص

رواں ہے دار و رسن کی طرف تری جانب
اسیرِ حلقۂ گیسوئے یار تھا جو شخص

وہ آج نوکِ سناں کا ہے والہ و شیدا
ہلاکِ طرۂ زلفِ نگار تھا جو شخص

بنا ہوا ہے گدائے رہِ نگارِ دماغ
دیارِ دل کا کبھی شہریار تھا جو شخص

وہ آج تیغِ رواں کا ہے ہمدم و دمساز
رفیقِ سر و لبِ جوئبار تھا جو شخص

وہ آج طنطنۂ طبلِ جنگ کا ہے امیں
انیسِ زمزمۂ آبشار تھا جو شخص

شعارِ مہرِ خزاں سے ہے آج گرمِ کلام
خطیبِ منبرِ ابرِ بہار تھا جو شخص

وہ آج صرصرِ خورشید سے ہے گرمِ ستیز
نسیم پیشہ و شبنم شعار تھا جو شخص

وہ آج صاعقہ بر دوش و سیل برکف ہے
سمن بدست و چمن درکنار تھا جو شخص

برائے ہم نفساں

خدا کا شکر کہ دورِ خزاں میں بھی اے جوشؔ
زبانِ دھر پہ افسانۂ بہار ہوں میں

ہر ایک آہ کو، سازِ طرب نہ کیوں سمجھوں
کہ فطرتِ غمِ گیتی کا رازدار ہوں میں

جو غم کی گرم چٹانوں سے پھوٹ نکلا ہے
زمینِ دل پہ خوشی کا وہ آبشار ہوں میں

سموم نے جسے پالا ہے وہ گلستاں ہوں
خزاں نے جس کو سنوارا ہے وہ بہار ہوں میں

نگاہِ حق میں ہوں روشن ضمیرو پاک نہاد
مذاقِ شیخ میں بدکیش و ہرزہ کار ہوں میں

بڑی دلیل ہے یہ بھی مری بلندی کی
کہ پیشِ زہد و ورع مستحقِ دار ہوں میں

جو ایک ہات پہ کرسی تو ایک ہات پہ عرش
زمیں کے فرش پہ وہ آسماں وقار ہوں میں
غرورِ عصمتِ کرّوبیانِ ہفت افلاک
قدم پہ جس کے جھکے وہ گناہ گار ہوں میں
دھڑکتا ہے مرے سینے میں دل رسالت کا
اگرچہ کافر و مست و شراب خوار ہوں میں
نہیں شراب کی حاجت نہیں مجھے واللہ
کہ اپنی ذات سے صہبائے مشکبار ہوں میں
مگر فقط پئے تہذیبِ نفسِ ہم نفساں
شریکِ محفلِ رندانِ بادہ خوار ہوں میں

راہِ طرب

اللہ رے آج جشنِ خرابات کا فروغ
لرزش میں تارِ ساز ہے گردش میں دورِ جام
چھائی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
رقصندہ آبِ نہر ہے تابندہ سقفِ بام
چھلکتی صراحیوں میں ہے روحِ رباب و چنگ
اٹھتی جوانیوں پہ ہے نورِ سحر تمام
نکھری ہوئی ہے نشے سے نمناک چاندنی
ڈوبی ہوئی ہے کیف میں بادِ سبک خرام
نغمے ہیں اپنے چشمۂ پنہاں سے ہم کنار
روحیں ہیں اپنے مرکزِ اصلی سے ہم کلام
جبریل سے بھی اٹھ نہ سکے جس کا ایک حرف
وہ آ رہے ہیں عالمِ ارواح سے پیام

گردش میں ہیں سروں پہ اٹھائے گلابیاں
ترکانِ ماہ پارہ و خوبانِ لالہ فام
آیا یہ کون راہِ طرب پوچھتا ہوا؟
چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبرِ انام
آنے دو، اس بزرگ کو، آنے دو روبرو
لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام
یہ ریش، یہ عمامہ، یہ حق آشنا نظر
راہِ طرب کی فکر میں نظریں بسوئے جام
ہاں۔ اِس طرف۔ قریب، ذرا اور کچھ قریب
اچھا...... جنابِ خضر ہیں! وعلیکم السلام

پروپیگنڈا

وہ جھوٹ، بار بار جو بولا گیا ہے آج
اِس وقت جس کے نام سے ہوتا ہے اختلاج
حق کی قلیل فوج سے کرتا رہے گا جنگ
بھرتا رہے گا ریب میں ربّانیت کا رنگ
ڈھلتا رہے گا قالبِ صوت و کلام میں
چھپتا رہے گا مطبعِ تبلیغِ عام میں
دائم رہے گا گرمِ سفر ایک حال پر
مخلوق کی حدیث و روائت کی تال پر
کھوتا رہے گا اپنی ضلالت گزیدگی
پاتا رہے گا شام و سحر سے رسیدگی
آتا رہے گا اہلِ جہاں کی زبان پر
چڑھتا رہے گا نشر و اشاعت کی سان پر

پکتا رہے گا ذہن کے مطبخ میں صبح و شام
گاتا رہے گا سانس کی نَے پر بہ التزام
بنتا رہے گا موجۂ تکرار میں گہر
بنکتا رہے گا حرف و حکایت کی آنچ پر
چڑھتا رہے گا اوجِ نظر پر بصد حشم
کاندھے پہ ماہ و سال کے رکھتا ہوا قدم
گاتا رہے گا وہم کی بزمِ سرود میں
پلتا رہے گا وقت کی نادیدہ گود میں
لیتا رہے گا جائزہ نزدیک و دُور کا
پیتا رہے گا دُودھ سنین و شہور کا
دامانِ عقل و جیبِ نظر پھاڑتا ہوا
ذہنوں کی رفعتوں پہ علَم گاڑتا ہوا
تا آنکہ ایک روز وہی ناسزا دروغ
حاصل کرے گا حلقۂ عالم میں وہ فروغ
اُس جھوٹ کو صداقتِ اعلیٰ کہینگے لوگ
آفاق کی حقیقتِ کبریٰ کہینگے لوگ

برسات ہے، برسات

آ دیکھ تو ساون کے برستے ہوئے لمحات ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذرات
کرتا نہیں کیوں عشق و جوانی کی مدارات اس رُت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے برسات

اے رندِ خرابات

ساحل پہ نئی آن ہے ہر ماہِ لقا کی ہر گام پہ کھلتی ہے گرہ زلفِ رسا کی
اللہ ری کرامت اثرِ لغزشِ پا کی رہ رہ کے لچکتی ہے کمر ارض و سما کی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

گرداب میں بادل کے ہے خورشید کا بیڑا — کھاتا ہوا پھرتا ہے تھپیڑے پہ تھپیڑا
کس فصل میں چھیڑے گا جواب راگ نہ چھیڑا — نوخیز اُمنگیں ہیں کہ پانی کا دڑیڑا

برسات ہے برسات ہے، برسات ہے برسات

برسات ہے برسات

اے رندِ خرابات

ہر ذرۂ ناچیز ہے اس وقت شرابی — ہر رندِ خوش اوقات کا چہرہ ہے شہابی
اربابِ شریعت کو مبارک ہو خرابی — پیمانہ چھلکتا ہے، دمکتی ہے گلابی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

میدان میں رقصاں ہے برستا ہوا پانی — یاروں کی طبیعت میں ہے دریا کی روانی
پہنے ہے کوئی سُرخ لباس اور کوئی دھانی — ہر چہرۂ رنگیں سے اُبلتی ہے جوانی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

گلزار میں کوئل کی صدا گونج رہی ہے — کہسار میں پُرشور ہوا گونج رہی ہے
قُلقُل سے جنوں خیز فضا گونج رہی ہے — میدان میں گھنگھور گھٹا گونج رہی ہے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

کافر ہوں اگر لاؤں نہ تقوے پہ تباہی — بوتل کی یہ سُرخی، یہ گھٹاؤں کی سیاہی
اور اُس پہ کسی شوخ کی دزدیدہ نگاہی — بھر جام کہ آتی ہے جماہی پہ جماہی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

انبوہ حسینوں کا ہے دریا کے کنارے — طوفاں ہے، تلاطم ہے، ترانے ہیں، ترارے
پھرتے ہیں نظرباز بھی سینوں کو ابھارے — جھُولے ہیں، جھماجھم ہے، چھماچھم ہے، اشارے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

آ مست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں — چھلکائیں مئے ہوش ربا، جام کو چومیں
کیا دہر، دو عالم کو کریں غرق سبو میں — ہستی سے گزر جائیں مچاتے ہوئے دھومیں

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

رنگین فضاؤں میں گھٹا جھوم رہی ہے — دریا میں تلاطم ہے، ہوا جھوم رہی ہے
لہروں پہ ملاروں کی صدا جھوم رہی ہے — ساغر میں مئے ہوش رُبا جھوم رہی ہے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رندِ خرابات

سنتا بھی ہے موسم کے خنک راگ شرابی؟ — ہاں موڑ سوئے ساغر و مُل باگ، شرابی
پیمانے سے پانی میں لگا آگ شرابی — ہاں کاگ اُڑا، کاگ اڑا، کاگ، شرابی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات

برسات ہے، برسات

اے رند خرابات

نوحۂ فراق

فرقت میں حالتِ دلِ ویراں نہ پوچھیے
تقدیر نے کیا ہے جو احساں، نہ پوچھیے

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے
میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھیے

بگڑے ہوئے نصیب کی آندھی کے سامنے
کیونکر چراغ تھا تہِ داماں نہ پوچھیے

یارانِ بزم، صبحِ وطن سی عزیز شے
کیونکر بنی ہے شامِ غریباں نہ پوچھیے

ڈر ہے عروسِ وقت کی نبضیں نہ چھوٹ جائیں
شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں نہ پوچھیے

رہ رہ کے اِن پہاڑ سی راتوں میں بار بار
ڈستا ہے دل کو کیوں مہِ تاباں نہ پوچھیے

ڈالا ہے جس نے لا کے یہاں اس عذاب میں
کیا اب بھی اُس خدا پہ ہے ایماں، نہ پوچھئے

(۲)

ہنگامۂ وداع کسی دوشِ ناز پر
کیوں کھل پڑی تھی زلفِ پریشاں، نہ پوچھئے
وقتِ فراق، کاکلِ برہم کی چھاؤں میں
افسردگیٔ چہرۂ تاباں، نہ پوچھئے
اُس نازنیں کے جذبۂ بے اختیار سے
کیونکر جیا تھی دست و گریباں، نہ پوچھئے
افشائے رازِ عشق و محبت کے خوف سے
اُن انکھڑیوں کا گریۂ پنہاں، نہ پوچھئے
وقتِ سفر چھڑی تھی جو اک لمحہ پیشتر
وہ داستانِ دیدۂ جاناں، نہ پوچھئے
شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا
اُس بُت کا التفاتِ فراواں، نہ پوچھئے
ہیں اب بھی جوش کو جو سہارا دئے ہوئے
اُس شوخ کے وہ عہد، وہ پیماں، نہ پوچھئے

سلام

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ربانی کے ساتھ
دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ

حشر تک زندہ ہے تیرا نام اے ابنِ رسول
کر چکا ہے تو وہ احساں نوعِ انسانی کے ساتھ

اُن کے آگے صولتِ دنیا کا ذکر، او ابنِ سعد
کھیلتی ہے جن کی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ

غیرتِ حق کو کہیں دیکھو نہ آجائے جلال
ظالمو ہولی نہ کھیلو خونِ ایمانی کے ساتھ

باندھتی ہو کیا ہوا اے اہرمن کی آندھیو
کھیلنا آساں نہیں ہے شمعِ یزدانی کے ساتھ

ہمتِ معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر
یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ

صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن
خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ

آنکھ میں آنسو ہوں، سینے میں شرارِ زندگی
موجِ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ

جوشؔ ہم ادنیٰ غلامانِ علیِ مرتضیٰ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہانبانی کے ساتھ

فتحِ باب

عشق کی جاں بخش دیوی نے زراہِ التفات
دیکھ کر مجھ کو کہ یہ ہے بے نیازِ کائنات
اپنے اُن ہاتوں سے جن کا رابطہ ہے ساز سے
میرے دروازے پہ دستک دی عجب انداز سے
رات آدھی آچکی تھی، اور دُنیا تھی اُداس
دیکھتا کیا ہوں درازوں سے کہ دروازے کے پاس
عشق کی دیوی کے گردو پیش ہے یارو ئے زرد
دشمنوں کی دوستداری، نوعِ انسانی کا درد
لالہ گوں قدموں کے نیچے فرقِ حُبِّ مال و جاہ
سامنے مُبہم تمناؤں کی دھندلی سی سپاہ
پُشت پر اُلٹے ہوئے موہوم چہروں سے نقاب
بے سرو پا حوصلے، ناقابلِ تعبیرِ خواب

دھجیاں اُڑتی ہوئی ملبوسِ ننگ و نام کی
دِل میں موجِ درد، سر پر بدلیاں اوہام کی
ہر تبسم، آنسوؤں کی اوس میں ڈوبا ہوا
ہر نفس میں نرم دل کے ٹوٹ جانے کی صدا
اِک طرف شوقِ سجود و ذوقِ تکمیلِ حیات
اِک طرف بیداریٔ ایثار و حبِ کائنات
عارضوں پر جھلکیاں سی، برق و باراں کی طرح
زلف پر عکسِ جنوں، بالغیب ایماں کی طرح
دل مرا اس طور سے کانپا کہ سکتا ہو گیا
ہات تا زنجیر پہونچا، اور دَر، وا ہو گیا
میں اگر در کھولنے سے روک لیتا اپنا ہات
ہاں ضرور اربابِ دانش کو پسند آتی یہ بات
نوعِ انسانی کے غم سے یوں نہ رہتا بے قرار
دائمی آلام کا ہوتا نہ میرے دل پہ بار

سرشاریاں

آج تو ہر ذرّہ اے پیرِ مغاں سرشار ہے
رند کیسے، خود شرابِ ارغواں سرشار ہے

وقت کی رفتار میں پیدا ہیں لاکھوں لغزشیں
روحِ ماہ و سال کیا، کون و مکاں سرشار ہے

کیف میں ڈوبے ہوئے ہیں مطربوں کے زیر و بم
نشّہ چھایا ہے زمیں پر، آسماں سرشار ہے

پستی و بالائی و مرگ و حیات و ہست و بُود
آج تو انساں کا ہر وہم و گماں سرشار ہے

باغِ عشرت میں نشاطِ مے کشاں ہے غرقِ جام
کوئے عصمت میں گروہِ قُدسیاں سرشار ہے

جسم سے تا عالمِ ارواح چھایا ہے سرور
داستاں گو ہی نہیں، خود داستاں سرشار ہے

چل رہی ہے آج کچھ اِس لوچ سے بادِ مراد
بحر میں کشتی، ہوا پر بادباں سرشار ہے

ساجد و مسجود میں دشوار ہے آج امتیاز
سر اگر بدمست ہے تو آستاں سرشار ہے

آئینہ کیسا، سکندر کو ہے حال آیا ہوا
اِنس و جاں کیا، خود خدائے اِنس و جاں سرشار ہے

حسن اگر مدہوش ہے تو عشق ہے مدہوش تر
کارواں سے بڑھ کے میرِ کارواں سرشار ہے

پھر لبوں کی گُل فروشی سے جواں ہے زندگی
پھر کمر کے لوچ سے عمرِ رواں سرشار ہے

جوشؔ اے سرخیلِ رنداں، مرحبا صد مرحبا
آج تیرے جام سے ہندوستاں سرشار ہے

قلبِ ماہیّت

اِک مُدعیٔ ہوش سے کل میں نے یہ پوچھا
آتے ہی دکن آپ یہ کیوں ہو گئے بے خود؟

حیراں ہوں کہ اِس فطرتِ خود دار کے اندر
پیدا ہُوا کِس طور سے میلانِ تعبُّد؟

تھا پیشتر اِس سے تو بہت دعوئے اخلاص
سا لوس برتنے میں ہے اب کیوں یہ تشدّد؟

لے دے کے ہے اب تو اِسی ٹیشن ہی کی نالش
حضرت تو یہ فرماتے تھے بندہ ہے زمرّد!

کل ساکنِ کعبہ تھے، اور اب دیر نشیں ہیں
پیدا ہُوا کیوں لفظِ مُعرّب میں تہنُّد؟

کل محفلِ خوباں میں تھے، اور آج ہیں تنہا
کیوں رنگِ تاہّل سے مِلا آ کے تجرّد؟

کیا پھونک دیا کان میں عفریتِ ریا نے ؟
سلمائے وفا سے ہے جو اس درجہ تمرد
کچھ آپ میں اس طرح معائب ہوئے پیدا
جن کے گھر جیسے ہو شیطان تولّد
آج اہلِ ہوس میں بھی نہیں آپ نمودار
کل حلقۂ عشاق میں حاصل تھا تفرّد
کل عشق کی محراب میں ہوتی تھیں نمازیں
اب گنبدِ اغراض میں پڑھتے ہیں تہجّد
کیوں زاغ ہیں اک کنگرۂ اہلِ دول کے
تھے خیر سے پہلے تو سلیمان کے ہُدہُد
یوں آپ کو اب اہلِ ریا سے ہے تشابہ
اشعار میں جس طور سے ہوتا ہے توارد
یہ کہہ کے رُکا ہی تھا کہ ہاتف نے صدا دی
"ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شُد"

شرابِ پرتگالی

گھٹائیں وہ اٹھیں قبلے سے کالی
امورِ شرع کا اللہ والی

خطا کیا ہے اگر میں جام بھر کر
غمِ دنیا سے دل کرتا ہوں خالی

بہار آئی ہے اٹھ اے بادہ کش اٹھ
بہ عزمِ توبہ فرمایانِ عالی

شرابِ تلخ میں آ غرق کر دیں
خطیبِ شہر کی شیریں مقالی

دو عالم کی جوانی پر ہے بھاری
مئے انگور کی پیرانہ سالی

نہ جانے کون تھا وہ مومنِ پاک
یہاں جس نے بنائے کفر ڈالی

خدارا پھینک دے تشریفِ ناموس
بوضعِ عاشقانِ لاابالی

ترے اشعار کے شیشوں سے اے جوش
چھلکتی ہے شرابِ پرتگالی

شبابِ جمال

نظر پڑی مری کل اک ضعیف عورت پر — فسردہ جلوہ و محزوں جمال و خفتہ نظر

جبیں پہ ثبت تھی اس طرح ماہ و سال کی مہر — مہِ صیام کی جیسے فسردہ ساعتِ ظہر

غمِ شباب سے یوں جھریاں تھیں عارض پر — سحر کو جیسے جوانی کا پُرشکن بستر

سپاٹ لوحِ جبیں کا نہ پوچھئے عالم — سفید برگ سے گویا اُڑی ہوئی شبنم

کہ اتنے میں جو اُٹھایا نظر جھکا کے ستار

لبوں پہ آگئی سرخی، دمک اُٹھے رخسار

اُٹھی نظر تو قمر کا ہوا جبیں پہ نزول — ہلے جو لب تو برسنے لگے گلاب کے پھول

فسردہ شیب کو دینے لگی نویدِ شباب — مچل مچل کے رگ پئے میں جنبشِ مضراب

ہنر کے حسن جنوں خیز کو نہ کیوں چاہوں — بڑھی جو تان کی گرمی تو دیکھتا کیا ہوں

بساطِ نغمہ پہ گویا کنول جلائے ہوئے

کھڑی ہوئی ہے جوانی نقاب اُٹھائے ہوئے

رازِ حیات

بزدلی، دُوں ہمتی، بے مائگی، خوابِ گراں
تجھ پہ اور یہ لعنتیں، افسوس اے ہندوستاں

برچھیاں محزوں، بگل خاموش، پرچم تارتار
خود غمگیں، طبلِ جنگ افسردہ، نیزے دلفگار

دل میں خوفِ مرگ، رُخ پہ بزدلانہ اضطراب
ولولے، سردر گریباں ہمتیں مصروفِ خواب

کرب سے خنجر فسردہ، خستہ جانوں کی طرح
غم سے تیروں کی کمریں خم کمانوں کی طرح

عزم کے مضبوط رشتے ہات سے چھوٹے ہوئے
زنگ کے پردوں میں تلواروں کے دل ٹوٹے ہوئے

ہند کچھ سنتا نہیں، کس سے کہوں یہ ماجرا
یہ ہے انسانوں کا جنگل کون سنتا ہے صدا

کون ہندو سے کہے اے لالۂ دولت نواز
اب بھی ہے کیا تجھکو گروانِ مہابھارت پہ ناز؟
کون مسلم سے کہے اے مؤمنِ زار و نزار
لَا فَتَیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفَقَار
کشتیٔ ملت کو اس طوفاں میں کھینے کے لئے
کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کے لئے؟
آہ اے ہندوستاں مشرق کی اے تاریک رات
کہہ رہا ہوں کب سے میں کمبخت یہ رازِ حیات
باگ میں ہے شہسواروں کی، نظامِ زندگی
اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ ہے پیامِ زندگی
جان لے اے ہند اے ذرّات کے خادم پہاڑ
موم بن جاتا ہے لوہے سے جو کرتا ہے بگاڑ
صرف ہلکی آنچ کی یورش سے گل جاتا ہے موم
گرمیٔ اغیار کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے موم
تجھکو لوہا بن کے دنیا میں ابھرنا چاہئے؟
یہ اگر ہمت نہیں، تو ڈوب مرنا چاہئے؟

فیضانِ ساقی

آج کل پھر بخشش پیرِ مغاں کی دھوم ہے
دولتِ بیدار و بختِ کامراں کی دھوم ہے

پھر خروشِ مطرباں، وجوشِ یاراں کے طفیل
لحنِ رنگین و شرابِ ارغواں کی دھوم ہے

باغ میں پھر جلوۂ گُل سے ہے اِک محشر بپا
بزم میں پھر شوخیِ چشمِ بتاں کی دھوم ہے

پھر فلک پر ابرِ گوہر بار کے ہیں غُلغلے
پھر زمیں پر کاکُلِ عنبر فشاں کی دھوم ہے

بزم میں پھر خندۂ عشاق کے ہیں زمزمے
باغ میں پھر بلبلِ افسانہ خواں کی دھوم ہے

حلقۂ رنگین یارانِ محبت پیشہ میں
پھر کسی کے التفاتِ بیکراں کی دھوم ہے

پھر مچلتی چاندنی کے نقرئی آغوش میں
پیچ و خم کھاتے ہوئے آبِ رواں کی دھوم ہے
پھر کہیں رُکتا نہیں رخشِ مزاجِ دلبری
پھر کسی نو شہسوارِ خوش عناں کی دھوم ہے
آدم و حوا کے جرمِ اولیں کی یاد میں
جشنِ زیرِ تاک و رقصِ گل رخاں کی دھوم ہے
عطر سے مہکے ہوئے ایوانِ رقص و رنگ میں
لمسِ شیرینِ حریر و پرنیاں کی دھوم ہے
پھر کھنکتے ہیں پیالے گنگناتا ہے شباب
پھر شرابِ کہنہ و حسنِ جواں کی دھوم ہے
جوشؔ کے انفاس سے مہکی ہوئی ہے زندگی
دُور تک اِس شاعرِ ہندوستاں کی دھوم ہے

مجموعۂ اضداد

مرا اک دوست ہے اضداد کا مجموعۂ کامل
کبھی جلوے دکھاتا ہے کبھی روپوش ہوتا ہے
کبھی ملتا ہے مثلِ عاشقِ خونیں کفن مجھ سے
کبھی آغوش میں معشوقۂ گل پوش ہوتا ہے
کبھی اُس کی ادائیں بے رُخی کے تیر ہوتے ہیں
کبھی اُس کی زباں میں دلبری کا جوش ہوتا ہے
کبھی ذوقِ تعقل میں سراپا ہوش بنتا ہے
کبھی فرطِ جنوں سے بیخود و بیہوش ہوتا ہے
کبھی خونِ وفا کر کے عداوت کیش بنتا ہے
کبھی دادِ وفا دیکر عقیدت کوش ہوتا ہے
کبھی تلقین فرماتا ہے ترکِ بادہ خواری کی
کبھی خود ہی انیسِ بزمِ نوشا نوش ہوتا ہے

کبھی غارت گرِ ذوقِ نگاہ و نغمہ بنتا ہے
کبھی غمخوارِ چشم و کارسازِ گوش ہوتا ہے
کبھی ابرِ کرم کی چھاؤں میں کرتا ہے تقریریں
کبھی فرطِ غضب کی آگ سے خاموش ہوتا ہے
کبھی ملتا ہے عیسیٰ در بغل عمر خضر بر کف
کسی دن تیغ در دست و کفن بر دوش ہوتا ہے
کہ درت سے کبھی کھنچتی ہوئی تلوار بنتا ہے
محبت سے کبھی کھلتا ہوا آغوش ہوتا ہے

غرض اے جوش وہ مجموعۂ الطاف و بے مہری
کسی دن نیش ہوتا ہے کسی دن نوش ہوتا ہے

نیت کا پھل

عجب وہ زمانہ تھا عہدِ نسلِ انساں
بلندی پہ چڑھتی چلی جا رہی تھی

نہ ہاتھوں میں خنجر، نہ تیغیں کمر میں
ترانے مگر فتح کے گا رہی تھی

فلک راحتیں بے طلب دے رہا تھا
زمیں خود سے عقدوں کو سلجھا رہی تھی

ہر اک قطرۂ آب، اُگلتا تھا موتی
ہر اک خار سے بوئے گل آ رہی تھی

ہر اک آنکھ میں حسن لیتا تھا لہریں
ہر اک دوش پر زلف بل کھا رہی تھی

مسرت کی میٹھی ندی تھی خراماں
فراغت کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی

سرِ بزمِ عالم بشاشت کی دیوی
بصد دلبری ناز فرما رہی تھی

نمو ریشے ریشے میں دوڑا ہوا تھا
صبا غنچے غنچے کو چٹکا رہی تھی

ہواؤں کی رَو سے برستا تھا امرت
گھٹا زندگی کی جھکی آ رہی تھی

فضا سے ٹپکتی تھیں صہبا کی موجیں
صبا موجِ کوثر کو شرما رہی تھی

کہ اتنے میں بدلی جو نیت ہماری
پلٹ دی مشیت نے قسمت ہماری

تہذیب

گو یہ دعویٰ سچ ہے اے تہذیب کی روشن جبیں
جگمگا اُٹھتا ہے پرتو سے ترے صحنِ زمیں
وجد آتا ہے زمانے کو ترے اشغال پر
ناچتی ہے خلق تیرے گھنگروؤں کی تال پر
تیری ہی تعلیم سے کرتا ہے حاصل روزگار
گفتگو کی سحر انگیزی، خموشی کا وقار
سیکھتی ہے تیرے ہی مکتب میں بزمِ آب و گِل
کس ادا سے مسکرا کر فتح کر سکتے ہیں دِل
تیری ہی رعنائیوں سے یہ سبق لیتے ہیں ہم
گلستاں میں یوں اٹھاتے ہیں نزاکت سے قدم
حرفتوں کی کارفرما صنعتوں کی کردگار
شعر و موسیقی پہ آتی ہے ترے دم سے بہار
مانگتی ہے بھیک میں تجھ سے تبسم کائنات
تیری لَو سے جگمگا اٹھتی ہے محرابِ حیات

شمع سے رہتا ہے بالا تیرے پروانوں کا رنگ
شوخ تر ہوتا ہے مے سے تیرے پیمانوں کا رنگ

بے شنیدن خلق ہوتی ہے طرب سے بہرہ یاب
دہر میں بجتا ہے جب تیری مشینوں کا رباب

ساتھ ساتھ آتی ہیں حوریں ناز فرماتی ہوئی
جب تری صنّاعیاں اُٹھتی ہیں اٹھلاتی ہوئی

نشّے کی کلیاں چٹکتی ہیں تری گفتار میں
سحر ہوتا ہے تری پازیب کی جھنکار میں

کھیلتی ہے تیری صبح و شام بازاروں کے ساتھ
جشن ہوتا ہے ترا سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

تُند گامی سے تری اے مرکبِ برق آفریں
کانپ کر اپنی طنابیں کھینچ لیتی ہے زمیں

ولولوں کے واسطے ہوتا ہے سازِ فتح یاب
ناز سے اُٹھکیلیاں کرتا ہوا تیرا شباب

وجد میں آتی ہے اہلِ انجمن کی زندگی

سرسراہٹ سُن کے تیرے ریشمی ملبوس کی
عیش کا جذبہ شباب آمادہ ہو کر خواب پہ
کروٹیں لیتا ہے تیرے بسترِ سنجاب پر
کنگنوں میں تیرے ہوتی ہے وہ رنگیں روشنی
مسکراتی ہے کلائی نوعروسِ دھر کی
پینگ تو دیتی ہے دل کو نرگسِ بیمار میں
کشتیاں کھیتی ہے امواج لب و رخسار میں
طاقِ زریں مشعلوں کے جگمگانے کی ادا
اللہ اللہ تیرے رنگیں مسکرانے کی ادا
لوچ آجاتا ہے تجھ سے حسن کی رفتار میں
لوچ بھی ایسا، جو ہوتا ہے اُپی تلوار میں
شب کے سناٹے میں جنت کو صدا دیتی ہے تو
چاندنی کو موجِ افشاں میں کھپا دیتی ہے تو
نازنینوں کے تبسم میں، پئے تکمیل کار
تو ملا دیتی ہے اِک موہوم سی موجِ ستار

اپنے بربط میں بلا کے زیر و بم رکھتی ہے تُو
کیں تکلف سے عناصر پر قدم رکھتی ہے تُو
لیکن اسے آرائش و انداز کی پروردگار!
رُوحِ اِنسانی کو راس آتی نہیں تیری بہار
مسخ ہو جاتی ہے تجھ سے فطرتِ نوعِ بشر
ضرب پڑتی ہے براہِ راست تیری روح پر
جامۂ اخلاص ہو جاتا ہے تن پر تار تار
ہونٹ ہو جاتے ہیں مصنوعی تبسّم سے دوچار
برق دے کر سر بسر بے نور کرتی ہے ہمیں
"ایکٹر" بننے پہ تُو مجبور کرتی ہے ہمیں
تیرگی کی شمع پر جلتے ہیں پروانے ترے
ذوقِ کاوش کو سُلا دیتے ہیں افسانے ترے
وہ تری اکسیر ہے، اکسیر کو کرتی ہے خاک
ناز کر دیتا ہے تیرا، زندہ قوموں کو ہلاک
عیش کی افراط سے کرتی ہے جرأت کو خراب

تو جوانمردی کو دیتی ہے جہالت کا خطاب
اُس صلابت پر، کہ جس پر زندگی کا ہے مدار
لوریاں دے دے کے کرتی ہے نزاکت سے دوچار
تُو امیروں سے دلاتی ہے فقیروں کو خراج
چھین لیتی ہیں تری برنائیاں شاہوں سے تاج
تیرے تکئے، خنجرِ بُرّاں ہیں پہلو کے لئے
تیرے بازو بند، سم ہیں زورِ بازو کے لئے
جیب میں رکھتی ہے تو، وہ تیز خواب آور دوا
کہتے ہیں جس کو زبانِ شعر میں "حُسن و ادا"
دیکھتے ہی سینۂ آہن میں لگ جاتا ہے زنگ
انگوٹھیوں میں تُو وہ رکھتی ہے شکر خوابی کا رنگ
جس بدن کو تو پہناتی ہے حریر و پرنیاں
سوکھ جاتی ہیں بالآخر اُس بدن کی ہڈیاں
رابطے ہیں جن کو تیرے خلعتِ گلفام سے
جلد اُن کی چھلنے لگتی ہے زِرہ کے نام سے

تیرا مارا دو گھڑی کلفت میں رہ سکتا نہیں
معرکے میں آنچ تلواروں کی سہ سکتا نہیں

زلف تیری، توڑ دیتی ہے سپاہی کی کمند
بخشتی ہے شیر کے سینے کو، قلبِ گوسفند

غازیوں کو مسکرا کر آئینہ دیتی ہے تو
قیمتِ آئینہ میں تلوار لے لیتی ہے تو

تندرستوں کو عطا کرتی ہے بیماروں کا لوچ
لرزشِ صہبا میں گم کرتی ہے تلواروں کا لوچ

زخم کو آسودۂ مرہم بنا دیتی ہے تو
انگاروں کو قطرۂ شبنم بنا دیتی ہے تو

شیشۂ دل چور کر دیتا ہے تیرا جامِ جسم
ہاتھ سے چھوٹے ہوئے جامِ بلوریں کی قسم

چھین لیتا ہے زمانے سے تری تانوں کا شور
فکر کی رفعت، ارادوں کی جوانی، دل کا زور

اوّل اوّل محو کر دیتی ہے تصویروں میں تو

پھر جکڑ لیتی ہے اہلِ فن کو زنجیروں میں تُو
گوشِ جاں کو نغمۂ شیریں سے بھر دیتی ہے تُو
پھر انہیں نغموں میں آخر دفن کر دیتی ہے تُو
کس قدر معشوقیت ہے تیری شانِ قہر میں
غرق کر دیتی ہے، تو رنگیں لبوں کی لہر میں
باز آئے ہم ترے، اس مرگ آور حلم سے
اے سیہ رُو! جہل ہی بہتر ہے ایسے علم سے
جھوٹ کے مرکب سے دم بھر بھی اُتر سکتی نہیں
راستی کو تو کبھی برداشت کر سکتی نہیں
جلوۂ حُسنِ حقیقت کو دبا دیتی ہے تُو
اپنے افسانوں کے پردوں میں چھپا دیتی ہے
دیدۂ افکار کو بے نور کر دیتی ہے تُو
حُسنِ فطرت سے بشر کو دُور کر دیتی ہے تُو
الاماں قانون و مذہب تیرے فرزندانِ زشت
جن سے بن جاتی ہے دوزخ بزمِ فطرت کی بہشت

آدمی تیری ندی میں ناؤ کھے سکتا نہیں
اپنی فطرت کے مطابق سانس لے سکتا نہیں
وہم پرور جذبۂ تقلید کی بانی ہے تو
دشمنِ آزادیٔ افکارِ انسانی ہے تو
رہ چکے جس وقت تک رہنا تھا قسمت میں غلام
اے فنا انگیز دیوی! دُور سے تجھ کو سلام
تیرے ہاتوں ایک مدت تک زمانے سے رہے
مر وہیں، تو اب ترے دھوکے میں آنے سے رہے

مُڑی ہُوئی پتّی

ایک فتنۂ زمانہ بصد نازِ بے پناہ
موجِ رواں کی شان سے طے کر رہی ہو راہ
ہر ایک پیچ و خم پہ مجھے دیکھتی ہوئی
مڑ مڑ کے ہر قدم پہ مجھے دیکھتی ہوئی
چہرے پہ ایک گردسی گویا اُڑی ہُوئی
پتّی ہوائے تند کی زد پہ مڑی ہُوئی

نا آشنا مہمان

یہ کیسی ہیں حسینہ ادا نیم رس موہوم اُمیدیں؟
جو پیہم رنگتی پھرتی ہیں میرے گرم سینے میں
یہ میرے گرد کیسا درمیانی سا اُجالا ہے؟
جو ضَو کی دسترس سے دُور ہے ظلمت سے بالا ہے
یہ اِک تارا سی کیا شئے ہے نہ ہوتی ہیں نہ آنسو میں
یہ کیسے درد کی یارب چمک ہے میرے پہلو میں؟
یہ کیا عالم ہے؟ جب ساحل پہ دونوں وقت ملتے ہیں
شگوفے سے مرے تپتے ہوئے سینے میں کھلتے ہیں؟
ندی جب ہانپتی ہے، اور سورج ڈوب جاتا ہے
الٰہی کون یہ میٹھے سُروں میں گنگناتا ہے؟
یہ لیلیٰ کون ہے؟ انفاس کے بیچین محمل میں
یہ کیسے طرفہ اُلجھے ولولوں کا رقص ہے دل میں

یہ کیا اسرار ہیں سبزے کو جب شبنم بھگوتی ہے
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے
یہ شب کو کون یوں رہ رہ کے مجھ کو یاد آتا ہے!
دیا جیسے گھنے جنگل کے اندر ٹمٹماتا ہے
یہ کیسے طرفہ ارماں ہیں جو پیہم سانس لیتے ہیں
یہ قدسی کون ہیں رہ رہ کے جو پیغام دیتے ہیں؟
یہ دل میں کون یوں دلداریوں کے تخم بوتا ہے؟
اندھیرے میں گماں سا نور کا جس طرح ہوتا ہے
یہ طاری کچھ دنوں سے مجھ پہ کیسی بدحواسی ہے؟
اداسی میں بشاشت ہے بشاشت میں اداسی ہے
یہ کیسی لہر ہے؟ ہستی کے زخموں کو جو دھوتی ہے
یہ کس کی چاپ سینے میں مجھے محسوس ہوتی ہے؟
یہ کس ناآشنا سے مہماں کی آمد آمد ہے؟
یہ کس بے سمجھے بوجھے کارواں کی آمد آمد ہے؟

وِفاق

(جس کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہوگیا ہے)

دھومیں مچی ہوئی ہیں نظامِ وفاق کی
ہندوستاں ہنوز ظلوم و جہول ہے
اِس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گل
اِک بے پناہ چوک ہے، اک سخت بھول ہے
یہ بوستانِ اہلِ سیاست کی شاخِ گل
شیطاں کے پائیں باغ کی سوکھی ببول ہے
یہ ہے نیا نکاح کہ دولھا تو ہے خموش
قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ دِل سے قبول ہے
ہشیار اہلِ ہند کہ پھر اِس زمین پہ
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے
کہتے ہیں جس کو "دولتِ بیدار" اہلِ غرب
وہ اِک متاعِ کاسد و جنسِ فضول ہے
ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق   دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

آوارہ خیالات

تخت کی مجھکو تمنا ہے، نہ ذوقِ دیہیم
میری ہر سانس میں ہے دولتِ صد ہفت اقلیم

عقل جسے کہتے ہیں زمانے والے
میرے حلقے میں ہے منجملۂ یارانِ قدیم

شوقِ دیدار کی وہ آگ ہے میرے دل میں
جسکے اِک اِک شرر میں ہیں نہاں لاکھ کلیم

اوجِ افلاک پہ ہیں فاقہ کشوں کی آہیں
کون کہتا ہے کہ رزّاق نہیں، ربِّ کریم

کون بادل ہے کہ زخموں سے نہیں ہے خونبار
مرحبا اے کرمِ عام و زہے فیضِ عمیم

کتنے شمشادِ فراواں ہیں مری نظروں میں
اس قدر موج نہ دکھلا مجھے اے موجِ نسیم

تو میرے لمحۂ الہام میں اے روحِ حیات
آخر آہی گئی تسلیم، اِدھر آ تسلیم

تجھ سے کتنے مرے آغوشِ بصیرت میں دیکھ!
مجھ سے بھی عربدہ، کونین کے اے رازِ عظیم!

گدائے ہندوستاں

ہر سانس میں جواں ہی نہیں نوجواں ہوں میں
شکرِ خدا کہ بندۂ پیرِ مغاں ہوں میں

چلتی ہے جس کی موج پہ کشتیِ حیات کی
اے ہمنشیں، وہ نغمۂ آبِ رواں ہوں میں

دیدارِ حق کی شرح نہ کر اے فقیہِ شہر!
آگاہ ہو کہ ناقدِ حُسنِ بتاں ہوں میں

میرے نفس سے گرم ہے بازارِ زندگی
اِس جسمِ کائنات کی روحِ رواں ہوں میں

اے بادِ صبح چل، کہ ہوں تیرا ندیمِ خاص
اے شاخِ گُل، لچک، کہ ترا رازداں ہوں میں

ہر شب، بساطِ بادہ کشی پر ہوں جلوہ گر
ہر صبح، صدرِ مجلسِ روحانیاں ہوں میں

قیمت ہے جس متاع کی خود روحِ مشتری
اے اہلِ کاروبار! وہ جنسِ گراں ہوں میں
ارضِ تعینات میں ہوں نورِ بے جہت
پہلوئے کائنات میں قلبِ تپاں ہوں میں
تاروں کی مست چھاؤں میں ہنگامِ ناؤنوش
کہتا ہے دل کہ خالقِ کون و مکاں ہوں میں
مجھکو حدیثِ فرش سناتا ہے ہمنشیں!
خاموش ہو کہ شاعرِ عرش آشیاں ہوں میں
میں اور بے گناہ کئے سانس لے سکوں
کیا سادہ لوحِ صورتِ کرّ و بیاں ہوں میں
روشن ہیں مجھ سے حسن و جوانی کی مشعلیں
پروردگارِ عربدۂ مہوشاں ہوں میں
کھلتے ہیں زیرِ دم سے مرے رازِ کائنات
گویا دہانِ ارض و سما کی زباں ہوں میں
صدہا شعور جس پہ تصدق وہ نشہ ہوں

لاکھوں یقین جس پہ فدا، وہ گماں ہوں میں

صدیوں کے بعد بھی جو پڑھے گا مرا کلام
آواز دوں گا میں، کہ ابھی تک جواں ہوں میں

شاہوں سے جو نہ لے کے رہے گا جو کل خراج
ہاں وہ گدائے کشورِ ہندوستاں ہوں میں

الھڑ

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا
سر پہ چُندری نہ ہات میں چھلّا

نور ساکن ہے، نار ہے بیتاب
ہو رہی ہے طلوعِ صبحِ شباب

انکھڑیوں میں حیا نہ طرّاری
نہ نگاہِ کرم، نہ بیزاری

ایک جھلکی ہوئی سی شانِ حجاب
ایک کھویا ہوا سا استعجاب

رُخ پہ ہلکی سی کشمکش سی ضرور
لیکن اِس طرح جیسے تحتِ شعور

آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے
زلف کھولے نظر اٹھائے ہوئے

خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی
بے ارادہ مچل رہا ہے کوئی

ریاستوں کا ملکی نعرہ

ہلاکِ جور کردو، کشتۂ بیداد کر ڈالو
یہ کافر غیر ملکی ہیں انہیں برباد کر ڈالو
نئے مصحف، نئے دیوان و دفتر کی بنا ڈالو
کتابیں غیر ملکی دین و مذہب کی جلا ڈالو

مری صہبا ہو، میرا ہی سبو، میرا ہی پیمانہ
مرے گھر کا حرم ہو، میرے ہی صوبے کا بت خانہ
میں اب سمجھا کہ یہ اک غیر ملکی کا تخیل تھا
کہ فرقِ نسل و رنگ و قوم ہے ابلیس کا دھوکا
اگر تقدیر یاور ہے تو منہ غیروں سے موڑوں گا
لباسِ نوعِ انسانی کے ٹکڑے کر کے چھوڑوں گا
لبِ تقسیم ارضی ہی سے اب آئندہ بولوں گا
میں اب انسان کو مٹی ہی کے کانٹے میں تولونگا

نہ ہونگے صورتِ انسانی کے شجے تک ہی نئے ہیں
فقط جغرافیہ کا خون ہے میری رگ و پے میں
ہمیں اور رحم آئے غیر ملکی ہم صفیروں پر
کہ شجروں کی بنا ہے صرف نقشوں کی لکیروں پر
اخوت کے سمندر کو خزف ریزوں سے پاٹونگا
میں رشتے خون کے سب خاک کی قینچی سے کاٹونگا
بُریدہ ہو کے اپنے کُل سے نبضِ جزو چلتی ہے
کہ کٹ جاتی ہے جب تو چھپکلی کی دُم مچلتی ہے

مامتا اور محبت

راہ میں اک غریب عورت کے
عشق نے بڑھ کے تیر مار دیا
ایک رہرو نے اُسکے سینے میں
جذبۂ دلبری ابھار دیا
قلب نازک کو آنِ واحد میں
شوق نے مژدۂ بہار دیا
عشق نے حسن کی نگاہوں کو
جلوۂ تیغ آب دار دیا
اور عورت نے ایک لوچ کے ساتھ
طفل کو گود سے اتار دیا

بحضرتِ ساقی

تجھے کیا دورِ گل ہے، یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

حقیقت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی دو عالم کی
جو کچھ آتی بھی ہے ناقابلِ اظہار ہے ساقی

ترے مستوں کو روز و شب کی آویزش سے کیا مطلب
یہاں تو تیرگی بھی مطلعِ انوار ہے ساقی

ترے خدمت گذاروں کو حق و باطل سے کیا مطلب
یہاں تو "خیر" بھی "شر" کا رفیقِ کار ہے ساقی

یہاں ہر عقدہ، اک کھلتا ہوا در ہے فراغت کا
یہاں ہر قید اک گرتی ہوئی دیوار ہے ساقی

قسم اس جام کی رقصاں ہے جسمیں کیف و مستی
کہ اس مٹھی میں روحِ ثابت و سیار ہے ساقی

عقائد کے ہزاروں عقل فرسا کاروانوں کا!
فقط اک واہمہ ہی قافلہ سالار ہے ساقی

نہ گھبرا، انتہائی صبر و نرمی سے مداوا کر!
کہ عقل انسان کی اک عسکرِ بیمار ہے ساقی

بہت عجلت نہ فرما کاروبارِ دل کے اجرا میں
کہ یہ دنیا اسیرِ اندک و بسیار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اِک لرزہ براندام بے دینی
مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوش پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

رُوحِ اِستبداد کا فرمان

ہاں اے مرے ذی ہوش فسوں کار سپوتو
جاگے ہوئے محکوم دماغوں کو سلا دو

تہذیب کے جادو سے ہر اک پیر و جواں کو
اپنی روشِ عام کا نقّال بنا دو

چلتی ہیں جن افکار سے اقوام کی نبضیں
ذہنوں میں اُن افکار کی بنیاد ہلا دو

جو قفل سکھاتا ہے زبانوں کو خموشی
وہ قفلِ خطابات زبانوں پہ لگا دو

حاصل ہو جو پبلک کے اداروں کی صدارت
چندہ تو نہ دو صرف ترقی کی دُعا دو

اوروں کو جو روزی سے لگانے پہ مُصر ہے
چُپ کرنے کی خاطر اُسے روزی سے لگا دو

پہلے تو ہر ایک رہرو آزاد کو ٹوکو
مانے نہ اگر بات تو زنجیر پنہا دو

محکوم کو دو فکر و تامل کی نہ فرصت
ہر فرد کو بیہودہ مشاغل میں لگا دو

گھِر آئیں جو بادل کی طرح تند عناصر
آپس ہی میں اُن تند عناصر کو لڑا دو

دنیا میں پنپنے کے جو آئین سکھائے
کچھ دے کے اُسے دین کے دھندے میں لگا دو

بہتے ہوئے آنسو جو کریں رحم کی درخواست
پگھلے ہوئے الفاظ کا انبار لگا دو

چھیڑے کوئی کمزور اگر نغمۂ طاقت
اُس شخص کو تلوار کی جھنکار سُنا دو

روٹی کا جو طالب ہو اُسے بھوک سے مارو
جو بھوک کا شاکی ہو اُسے زہر کھلا دو

پانی کا طلبگار رہے جس کھیت کا دہقاں

اُس کھیت میں پانی کے عوض آگ لگا دو
سینے میں کھٹکتی ہے مرے جوش کی ہر سانس
اِس شاعرِ گستاخ کو سولی پہ چڑھا دو

بھیک کی آواز

تصوّر کیجئے اُس ملک کی بے دست وپائی کا
جہاں بستا ہے شاہِ بے نوائی نورکا تڑکا
جہاں بیدار ہوتے ہی فغاں ملتی ہے نالوں میں
گداؤں کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں کانوں میں

دِل کی دُنیا

میں نے اِک دُنیا نئی معلوم کی ہے رُوح میں
دلفریب و دلنواز و دل فروز و دل نشیں
اِس تڑپتے تلملاتے خاکدانِ غم سے دور
اِک دمکتے، جگمگاتے نجمِ پنہاں کے قریں
اِس جہاں کے لعل و گوہر سے سوا ہے جسکی خاک
اِس کرُے کے آسماں سے بڑھکے ہے جسکی زمیں
زندگی جس دہر میں ہے، اک غلامِ بے وقار
موت ہے جس دائرے میں اک کنیزِ کمتریں
جو ہے اِک ایسا انوکھا عالمِ تمکیں جہاں
ذہن کی آوارگی ہے کاوشِ دنیا و دیں
نُورِ جنت، نارِ دوزخ، خوفِ باطل، ذوقِ حق
ان تقیمِ افکار سے بیگانہ ہے جو سرزمیں

علتِ ایجادِ مرگ و زیست، جبر و اختیار
عقل کی اِس بیوگی سے جس کو کچھ نسبت نہیں

جس جہانِ آرزو میں، جس دیارِ سوز میں
لرزشِ مژگان تر ہے، شہپرِ روح الامیں
خون کی گردش میں مضمر ہے جہاں ذکرِ حبیب
نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں "حبل المتیں"

کون یہ در کھٹکھٹاتا ہے مرا؟ پوچھو کوئی؟
خیر ہو، کیا اِس طرف بھی آ گئے اہلِ زمیں؟
"آئے ہیں دنیا کے کچھ اوتار، مجرے کو حضور"
کہہ دو واپس جائیں، ملنے کی مجھے فرصت نہیں!

برسات کی ایک شام

(راجپوتانہ)

خنک ہواؤں میں اُٹھتی جوانیوں کا خرام
کنارِ دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پہ آسماں کی ترنگ
خنک ہواؤں کی بھیگی ہوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازیِ طفلانہ ابر پاروں کی
ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرّے میں ہیجان مست ہونے کا
ذرا سا ریل کی پٹڑی پہ رنگ سونے کا
شفق، ہلال، ندی، رنگ، ابر، سبزہ، ہوا
ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا

خفیف زمزمہ امواج کی روانی میں
فلک پہ رنگ درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چونچال
ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیّال
یہ جاں فروز مناظر، کہ دل لبھاتے ہیں
بچھڑ گیا ہوں کسی سے تو کھائے جاتے ہیں

نامراد باغباں

میں ہوں "ہندوستاں" شکارِ زوال
وہ فرنگی ہیں صاحبِ اقبال
ہار گوندھوں میں، پھول چُن چُن کے
"رشتہ" میرا ہو، "پھول" ہوں اُن کے

اثبات یا نفی

حجلے میں نہیں حجلہ نشیں کوئی، تو حیرت!
حجلے میں کوئی حجلہ نشیں ہے، تو تعجب!
اب تک نہیں قانونِ زمیں کوئی، تو حیرت!
اب تک کوئی قانونِ زمیں ہے، تو تعجب!
محبوب، رگِ جاں کے نہیں پاس، تو حیرت!
محبوب، رگِ جاں کے قریں ہے، تو تعجب!
پردے میں نہیں ماہ جبیں کوئی تو حیرت!
پردے میں کوئی ماہ جبیں ہے، تو تعجب!
محفل میں نہیں صدر نشیں کوئی، تو حیرت!
محفل میں کوئی صدر نشیں ہے، تو تعجب!

کہتے ہیں مذاہب جسے "دارائے دو عالم"
وہ ہے تو تعجب، جو نہیں ہے تو تعجب!!

دولہا کی واپسی[1]

"خیر، مجھ ماں کو بھلا بیٹھا تو کچھ بیجا نہیں
تجھ دُلہن کو بھول بیٹھا، آئے یہ کیونکر یقیں

"لیکن اے بیٹی مرا بیٹا سعادت مند ہے"
"سچ مچ اپنے مرنے والے باپ کا فرزند ہے"

"بیٹی، اِن بجھتی ہوئی آنکھوں میں نور آجائے گا"
"لال میرا، آج یا کل تک ضرور آجائے گا"

"دل مرا بے چین ہے اُس دلربا کے واسطے
"جا ذرا تصویر تو لے آ، خدا کے واسطے"

"ہاں بہو! کیوں سر جھکاتی ہے؟ اِدھر آ تو سہی"
"اِس پہ میں قربان، میرے دل کا ٹکڑا ہے یہی"

"بچپنا چہرے پہ ہے، بالوں میں ہلکے جال سے"
"چودھویں کا چاند شرماتا ہے میرے لال سے"

[1] ایک عورت کا فرزند باہر گیا ہوا تھا۔ جہاں وہ لاری سے کچل کر مر گیا تھا اور اس کی لاش لاری پہ گھر پہونچائی گئی تھی۔

"منہ سے کہہ آمین" "یہ کیسا حیا کا جوش ہے؟"
"میں دُعائیں دے رہی ہوں، اور تو خاموش ہے"
"ہائیں یہ آواز؟ لاری! اور یہ کیا اے خدا!"
لاش! یہ کیا، ہائے اے اللہ یہ کیا ہو گیا؟"
"کیا ہے یہ اماں؟ ہوا جاتا ہے کیوں دل پاش پاش"
"میرے بچے کا جنازہ، اور ترے دولہا کی لاش!"

اے خالقِ اربابِ نظر! جز مئے معشوق
میں تجھ سے کوئی اور تمنا نہیں رکھتا
حیران ہوں لیکن کہ بہ ایں دعوئ اکرام
یہ بھی ترا اخلاق گوارا نہیں کرتا

بھکارن شاہزادی

اک ضعیفہ ہانپتی آئی مرے گھر رات کو
دیدہ ہائے اشک افشاں میں لئے برسات کو

تابش مہرِ خزاں، پژمردہ گالوں میں لئے
آندھیوں کے پیچ و خم، ژولیدہ بالوں میں لئے

بے کسی سے خال و خد پر اک زرالی بیخودی
بھوک سے چہرے پہ لایعنی سی اِک سنجیدگی

سر دِ ماتھا، گردشِ تقدیر کا آئینہ دار
خاک میں سوئے ہوئے شوہر کا یا سنگِ مزار

غرق تھیں موجِ عرق میں جھرّیاں کی سب تہیں
جس طرح بچھڑے ہوئے کپڑے کی بھیگی سِلوٹیں،

جھرّیاں رُخ پر نہ تھیں قبریں تھیں ماہ و سال کی
اور وہ قبریں جو ہوں سیلاب سے بیٹھی ہوئی

جھرّیوں میں دفن تھی بیتے دنوں کی آن بان

جھرّیاں، یا زندگی کی تیز رو رتھ کے نشان

آنکھ کے حلقے تھے یا تاریکیاں شمشان کی

پتلیاں تھیں، یا اندھیری رات گورستان کی

لیکن اِس ہیئت پہ بھی بے داغ تھی لوحِ جبیں

جوہرِ اسلاف کو عُسرت مٹا سکتی نہیں

"کل سے میرے منہ میں اُڑ کر کھیل تک پہونچی نہیں"

"میرے گھر میں بھی تھا سب کچھ، لیکن اب کچھ بھی نہیں"

میں یہ کب کہتی ہوں جبّاری و خلّاقی نہیں"

"یہ تو سب کچھ ہے مگر مولیٰ میں رزّاقی نہیں"

کہہ کے یہ سہمی، ڈری، تھرّائی، اور پھر رُک گئی

"ہائے دہلی" منہ سے نکلا، اور گردن جھک گئی

(۲)

دفعتہً ساکن فضا کے رنگ، لو دینے لگے

تاجِ زر پہنے ہوئے کچھ عکس آئے سامنے

"حکمِ مولیٰ پہ ہیں شاکر، تجھ سے مل کر شاد ہیں"
"ہم سب اِس دریوزہ گر کے نامور اجداد ہیں"
"ہاں، ہمارا ہی یہاں کی سرزمیں پر راج تھا"
"ہاں یہ سر ہیں جن پہ کل ہندوستاں کا تاج تھا"

(۳)

موجِ ظلمت میں بدل جاتی ہے ہر اک موجِ نور
کھول آنکھیں کھول، انگریزی حکومت کے غرور!
صاحبِ تاج و نگیں تھے اہلِ عز و جاہ تھے
آج جو دریوزہ گر ہیں، کل وہ شاہنشاہ تھے!!

جامِ خالی

آج پھر جام میں محبوبۂ گلفام نہیں
آج پھر صبحِ قیامت ہے یہاں، شام نہیں

آج پھر کون و مکاں پر نہیں قدرت حاصل
آج پھر ارض و سما بندۂ بے دام نہیں

آج تقدیر سے پھر دل کے صنم خانے میں
شورِ ناقوس نہیں، جلوۂ اصنام نہیں

آج پھر فرش سے تا بارگہِ عرشِ بریں
ہمنشیں سلسلہ نامہ و پیغام نہیں

آج پھر چہرۂ دانش کے زبوں پرتو سے
روئے کونین پہ رنگینیٔ اوہام نہیں

آج پھر جیبِ تفکر میں بہ جبرِ قدرت
نقدِ تخئیل نہیں، دولتِ الہام نہیں

آج پھر دفترِ خاصانِ خدا میں اے جوش
وائے قسمت کہ مرا ذکر، مرا نام نہیں

خُدا ہو جا

اُٹھی وہ مست گھٹا، رقص آشنا ہو جا
اُٹھ اور باغ میں خود جھومتی گھٹا ہو جا

بٹھا دے کشتیٔ عالم کے ناخداؤں کو
خود آج کشتیٔ عالم کا ناخدا ہو جا

کلاہ و کفش کا کیا کام صحنِ بستاں میں
برہنہ سر ہو خدارا، برہنہ پا ہو جا

گھٹا میں شور بپا ہے کہ محو کر آداب
ہوا پکار رہی ہے کہ بے ریا ہو جا

بس آج مستی و رندی کی انتہا کر دے
کل آئے ایسی ہی شامت تو پارسا ہو جا

یہ کیا جمود ہے اے نو اسیرِ زلفِ حیات
خود آج فاتحِ عمرِ گریز پا ہو جا

بڑھ اور تختِ کیانی پہ جلوہ فرما ہو
اُٹھ اور صاحبِ جامِ جہاں نما ہو جا

تجھے معاملۂ غنچہ و صبا کی قسم
مثالِ خندۂ جاناں، گرہ کشا ہو جا

یہ شکلِ بندہ تو رہنا ہے عمر بھر اے جوشؔ
اُٹھ اور چند نفس کے لئے خدا ہو جا

خرابات

یہ خرابات ہے تقوے کا نہیں کام یہاں
عینِ طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں، رات کی رنگینی میں
وجد کرتا ہے فلک، صبح کے ہنگام یہاں

میکدے میں نہ ہوا ے شیخِ حرم نکتہ فروش
کہ ازل سے نہیں گنجائشِ اوہام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قرباں
خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

شکر باری کہ علی الرّغمِ فقیہِ خود بیں
حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

میکدے کا ہے مشیّت کے اشاروں پہ مدار
جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں

طوطیٔ قدس ہے اک رشتہ بپا صیدِ زبوں
طائرِ سدرہ ہے اِک مرغِ تہِ دام یہاں

سایۂ زلف سے ہے زینتِ دوشِ رنداں
ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

اثرِ بے بصری ہے طلبِ جاہ و نمود
ہدفِ مسخرگی ہے ہوسِ نام یہاں

گوشِ رندانِ قدح خوار ہے، اور لعلِ نگار
لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں

کسی سورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

شعلۂ عشق ہے اس راہ میں چڑھتی ہوئی دھوپ
مشعلِ عقل ہے خورشیدِ لبِ بام یہاں

منزلیں راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
رُو بہ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرو

اُس پہ قربان ہیں سَو جامۂ احرام یہاں

خوفِ عقبیٰ کی اداسی کے عوض چہروں پر
کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں

اک توہّم ہے رہ و رسمِ شمارِ مہ و سال
اِک تمسخر ہے نظامِ سحر و شام یہاں

ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیّت کا جلال
وقت رہتا ہے سدا لرزہ بر اندام یہاں

گردِ رندانِ سیہ مست، بصد عشوہ و ناز
حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گُل اندام یہاں

خوابِ صد سالہ کے مانند ہے، اے محرمِ راز
وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں

لب ہلاتے ہی جو دنیا کو ہلا دیتے ہیں
چند ایسے بھی نکل آئیں گے خُدّام یہاں

شکر ہے جوشؔ کہ اوراد و وظائف کے عوض
لب پہ ہے زمزمۂ حافظؔ و خیّامؔ یہاں

پیام

کس سے کہئے کہ ہجر کے ہاتوں — زندگی ہو چکی ہے مجھ پہ حرام
جو کبھی ناقدِ تبسم تھیں — اب وہ آنکھیں ہیں اور اشکِ مدام
میرے اوقات پر مسلط ہے — گریۂ صبحگاہ و نالۂ شام
صبح ہے اور خمارِ سرد نفس — شام ہے اور کیفِ اشک آشام
آہ آلود نغمۂ شیریں — اشک آمیز بادۂ گلفام
ایک ذوقِ سفر ہے، بے منزل — ایک آغازِ غم ہے، بے انجام
لفظ بے مغز ہے زباں کی بات — مغز بے لفظ ہے نظر کا کلام
لطفِ ذوقِ نظر کا کیا رونا — کہ نہیں اب تو نامہ و پیغام
وائے بر آرزوئے گرسنہ چشم — بند ہے بابِ جلوۂ لبِ بام
جان، پامالِ شوقِ طفل مزاج — دل، گزرگاہِ عشقِ سیل خرام
اے نسیمِ گرہ کشا اُن تک — کون پہونچائے دِل کا یہ پیغام
کہ ہے تو جس کے حکم کی پابند — عقل کو اُس کی ہو چکا ہے جذام

قول کی رُو سے ہے وہ رشکِ خواص — فعل کی رُو سے ہے وہ ننگِ عوام

چپکے چپکے مری رگ و پے ہیں — زہرِ غم کر رہا ہے اپنا کام

کچھ ہے خوفِ خدا تو بے تاخیر — کچھ محبت ہے تو بہ عجلتِ تام

افقِ دیدہ ھائے گریاں پر

جلوہ گستر ہو میرے ماہِ تمام

دردِ مشترک

سُنتے ہیں طوفان میں ڈوبا ہوا تھا اِک درخت

جس کی چوٹی پر نظر آتے تھے، دو آشفتہ بخت

ایک اُن میں سانپ تھا، اور ایک غمگیں نوجواں

دو ضدوں کا، ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں

سچ ہے، دردِ مشترک میں ہے وہ روحِ اتحاد

عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عناد

لیکن اے غافل مسلمانو! مُدبّر ہندوؤ!!

ہند کے سیلاب میں، اک شاخ پر تم بھی تو ہو

نعرۂ مردانہ

ہم نشیں، مجھ کو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر
کہ بلا خیز حوادث کی نظر ہے مجھ پر

جانتا ہی نہیں، درماندہ و حیراں ہونا
کھیل ہے غم سے مجھے، دست و گریباں ہونا

رشک ہے مجھ میں صعوبت کے پرستاروں کی
نشہ ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی

سیرِ گلزار ہے، شعلوں کا بھڑکنا مجھ کو
لحنِ شیریں ہے کمانوں کا کڑکنا مجھ کو

وجد کرتا ہوں میں چلتی ہوئی تلواروں پر
نیند آتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر

مسکراتا ہوں، حوادث کی شرر باری میں
تاؤ مونچھوں پہ میں دیتا ہوں، دل افگاری میں

اب مصیبت ہے، مصیبت کا نہ ہونا مجھ کو
کر دیا عشق کی نرم آنچ نے سونا مجھ کو

برسوں جھولا ہوں اُن اجداد کے گہواروں میں
صبح منہ دیکھتے تھے اٹھ کے جو تلواروں میں

تیغِ خونخوار کے مانند تھے ابرو جن کے
تیر سینوں ہی میں ہوتے تھے ترازو جن کے

اپنی تابندہ روایات کی کھاتا ہوں قسم
زہر امرت ہے مرے حق میں جراحت مرہم

ہوں، اگر دہر میں آثار ہیں پیکاروں کے
زخم ہیں دل پہ مرے، عشق کی تلواروں کے

ہوں، اگر حشر ہیں دنیا کے بلاخانے میں
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں

بحر میں آگ لگاتی ہے کہانی میری
گرمیٔ برق پہ ہنستی ہے جوانی میری

کتنے گرداب میں دیکھے ہیں کنارے مینے
کتنے کاٹے ہیں مچلتے ہوئے دھارے مینے

کتنے ادیان کی موڑی ہے کلائی میں نے
کتنے اصنام کو بخشی ہے خدائی میں نے

خوفِ جاں ہی نہیں، ہر خوف پہ خنداں ہوں میں
اک رہا خوفِ خدا "خیر! مسلماں ہوں میں"

پوچھو دم بھرتا ہے کب سے مری مداحی کا!
تجربہ، مملکتِ حسن کی سیاحی کا

جانتی ہیں سفرِ صعب کی گھاتیں مجھ کو
خوب پہچانتی ہیں عشق کی راتیں مجھ کو

کوئی گر نطق ہے اے دیدۂ حیراں تجھ میں
کتنے پُر ہول شب و روز ہیں غلطاں مجھ میں

تو نے کیا کیا نہ اٹھایا ہے مری شرحِ نیاز
تیز کرنوں کا غرور، اور کڑی دھوپ کا ناز

کس قدر شدّتِ سرما کے ہیں نشتر تجھ میں ؟
جذب ہیں کتنی بلیں برف کی اے سر تجھ میں

کس قدر لُو کے تھپیڑے ہیں جو افشاں تجھ میں ؟
کتنے طوفان ہیں اے سینۂ بریاں! تجھ میں ؟

دستِ بازو میں ہیں بپھرے ہوئے دریا کیا کیا
اس کفِ پا میں ہیں تپتے ہوئے دریا کیا کیا ؟

سر میں ہیں شورشِ کونین کے کس بل کتنے
گم ہیں کانوں میں گرجتے ہوئے بادل کتنے ؟

برق و باراں سے ہوئیں دشت میں باتیں کیا کیا ؟
غرق ہیں دل میں، برستی ہوئی راتیں کیا کیا

رند ہیں، خون کے دریا میں نہانے والے
جا بھی، اے سیلِ حوادث سے ڈرانے والے

غلط بخشی

الٰہی! یہی ہے اگر روزگار
کہ سینے رہیں اہلِ دل کے فگار

وزارت کو حاصل ہوں سرداریاں
شرافت کرے کفش برداریاں

دبے اہلِ باطل سے حق کی سپاہ
مصاحب ہوں اندھوں کے اہلِ نگاہ

سرِ محفلِ ممسکِ بدخصال
کریم آ کے پھیلائیں دستِ سوال

زمیں کی خوشامد کرے آسماں
مقلد ہوں گونگوں کے اہلِ زباں

سرِ راہِ افلاس با صد قلق
ادیب اپنے ماتھوں کا بیچیں عرق

جھکے خاک پر علم کی بارگاہ
جبینِ جہالت پہ کج ہو کلاہ

حماقت ہو، دوشِ خرد پر سوار
لئے رُخ پہ چاندی کے نقش و نگار

سعادت کرے نحس کا احترام
شجاعت کرے بزدلی کو سلام

زمیں جب دکھانے لگے طمطراق
لرزنے لگے چرخِ نیلی رواق

خزف اپنے مرکب کو جب ایڑ دے
گہر ہو رکابوں کو تھامے ہوئے

پئے شب روی جب خراماں ہو زاغ
نوا سنج بلبل دکھائے چراغ

اکابر کو مرکب بنائیں عوام
لئے ہات میں سیم و زر کی لگام

سرِ بزم گردانِ شمشیر زن
بنے بزدلی صاحبِ انجمن

حریمِ محبت کے اربابِ راز | اُٹھائیں ذلیل اہلِ دولت کے ناز
سرِ بزمِ جہل، آئیں اہلِ نظر | بشکلِ غلامانِ زریں کمر
کہے بندگانِ ہوس کو "حضور" | خدایانِ علم و ادب کا غرور
سفاہت پھرے مسکراتی ہوئی | "گدھے کو چھڑے سے بجاتی ہوئی"
ملے خار کو مژدۂ نوبہار | میسّر ہو اندھوں کو روئے نگار
اور اہلِ نظر، باہزاراں نیاز | اسیرِ تمنّائے زلفِ دراز
مریدانِ دیرینۂ اہرمن | خزاں میں بھی لوٹیں بہارِ چمن
رہیں فصلِ گل میں بھی بے برگ و بار | جہانِ معانی کے پروردگار
مچلتے ہوں جب آسماں پر سحاب | سفیہوں کے رخ پر ہو موجِ شباب
رہیں صبح سے شام تک بے گناہ | محبت کے اقطابِ گیتی پناہ
لئیموں کی ہر شب ہو غرقِ شراب | بنازِ نگاراں، بصوتِ رباب
رہیں فصلِ باراں میں بھی تشنہ کام | خرابات کے اولیائے کرام!

ہنر ہو اور اس درجہ بے آبرو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

الٰہی! بپاسِ ہنر دشمنی | بڑھا اس طرف ساغرِ جاں کنی
کدھر ہے خداوندِ بختِ دژم | سفاہت نوازی کی تجھ کو قسم

نہ رکھو پھول کو قیدِ خاشاک میں　　چھپا دے مجھے پردۂ خاک میں

مگر اے مُربّیٔ اہلِ ریا
میں دیوانگی میں یہ کیا بک گیا

مری ذات کو کر سکے پائمال　　تری خاک کی یہ نہیں ہے مجال
تری ذات جب تک کہ ہے استوار　　مجھے چھو سکیں گے نہ لیل و نہار
تری حیّ و قیّوم پائندہ ذات　　بہ الفاظ دیگر ہے میری حیات
مرے سامنے اے خدائے زمیں　　ترا آسماں بول سکتا نہیں
مری موت ہے یہ کہ زردار ہوں　　کہ شاعر ہوں دانائے اسرار ہوں
مجھے تیری دولت کی حاجت نہیں　　کہ دل میں یہ ذوقِ حماقت نہیں
مرے دل میں اور لکشمی کا وقار　　جو رہتی ہے اُلّو[1] پہ دائم سوار
جسے لوگ کہتے ہیں شاہنشہی　　نہیں مجھ کو منظور وہ ابلہی
مجھے زر کی جانب نہیں التفات　　مرا ایک حرف اور تری کائنات
یہاں موت ڈرتی ہے آتے ہوئے　　فقیروں سے آنکھیں ملاتے ہوئے

نہ گھبرا مجھے، خوئے نفرت نہیں
یہ رسمِ جنوں ہے شکایت نہیں

[1] ہندو صنمیات میں دولت کی دیوی یعنی لکشمی کی سواری اُلّو ہے۔

حُسنِ بازاری

نہیں، مجھے نہیں مرغوب حُسنِ بازاری
کہ اُس کی آنکھ ہے مہر و خلوص کا مرقد
وفا کو اُس کی سہی قامتی نہیں تسلیم
کہ اُس میں پیچ ہیں بے انتہا، تو خم بے حد
ہزار داغ ہیں اک ایک بیل بوٹے میں
جھلک رہی ہے بظاہر اگرچہ یہ مسند
صلائے عام ہے یارانِ بوالہوس کے لئے
کچھ اس سے بحث نہیں کوئی نیک خُو ہے کہ بد
من آں نگینِ سلیماں بہ ہیچ نستانم
کہ گاہ گاہ بر او دستِ اہرمن باشد

ولولوں کی تربیتیں

یاس! گو تیرا اثر ہے طبع پر ناخوشگوار
ہو چکا ہے تیرے ہاتھوں گو گریباں تار تار

گو مرے پہلو، تری تیر افگنی سے ہیں فگار
پھر بھی برگشتہ نہیں تجھ سے دلِ آشفتہ کار

گو ترے ضربات سے آئینۂ دل چور ہے
پھر بھی شاعر تیری عزت کے لئے مجبور ہے

تیری شامِ غم میں پنہاں ہے مری صبحِ بہار
سو رہا ہے تیرے زانو پر دلِ اُمیدوار

تیرے قبضے میں ہے میرا جذبۂ بے اختیار
تیرا دامن ہے مرے کملائے پھولوں کا مزار

شرح میرے شوقِ بیحد کی ترے قابو میں ہے
مقبرہ میرے تبسم کا ترے آنسو میں ہے

تیرے ویرانے میں جاکر جب کھپاتا ہوں دماغ
ولولوں کی تربتوں کا مجھ کو ملتا ہے سراغ
شب کو اُن قبروں پہ لَو دیتے ہیں میرے دل کے داغ
صبح تک جلتے ہیں جن پر دھندلے دھندلے سے چراغ
کتنی اُن قبروں کی لَوحیں مرکزِ آلام ہیں
ثبت جن پر میری مُردہ حسرتوں کے نام ہیں

ساقیا

ساقیا، وہ گھٹا اُٹھی کالی
ڈال پھر طرح نیک اعمالی
لَے سے خوشتر نہیں کوئی وارث
مَے سے بہتر نہیں کوئی والی
تو سیہ مست کیوں نہیں ہوتا
خود مشیّت ہے آج متوالی
ابلہی کی قسم، بہشتی ہیں
زاہدِ مدّظلہٗ العالی
عمرِ نوح و خضر سے بہتر ہے
اِک نفس کی بھی فارغ البالی
للہ الحمد جوشؔ میکش ہے
اور میکش بھی میکشِ عالی

اے تمنّا!

دیکھ اے میری تمنّا! اے عدوئے صبر و ہوش
ترک فرما! یہ تلاطم، یہ تموّج، یہ خروش

تا بکے یہ کشمکش، یہ کرب، یہ کلفت یہ بار
کب تک آخر یہ تشنّج، یہ تلاطم، یہ فشار؟

یوں گرج کر کیوں ہلاتی ہے جڑیں جذبات کی؟
گونجتی ہیں جس طرح راتیں بھری برسات کی

چھوڑ دے للّٰہ ترسانا ترسنا چھوڑ دے
یہ گرجنا، یہ کڑکنا، یہ برسنا چھوڑ دے

دل کو کیوں جھونکا ہے غم کے کھولتے گرداب میں
آنچ بن کر دوڑتی پھرتی ہے کیوں اعصاب میں

خوں میں کیوں تیرتی پھرتی ہے بل کھاتی ہوئی
دل کو دھڑکاتی ہوئی، آنکھوں کو برساتی ہوئی

چوٹ کھائے اژدہے کی طرح لہراتی ہے کیوں
آگ، ہاں دوزخ کی دل پر آگ برساتی ہے کیوں؟
کیوں گراتی ہے پیاپے بجلیاں؟ خاموش ہو
اے تمنا، اے جہنم کی زباں، خاموش ہو
اب تو دل میں آگ کا بہتا ہے دریا، رحم کر
اے تمنا، اے تمنا، اے تمنا رحم کر
کیوں جھکولے دے رہی ہے مجھکو اپنے زور میں
بند ہو جا میرے دل کے حجرۂ پرشور میں
بند ہو جا قلب میں اے قلزمِ کفِ در دہاں
بند کر لے جملہ دروازوں کو چن لے کھڑکیاں
بند ہو جا اے تمنا بند ہو جا اس طرح
قبر کے گوشے میں رکھ دیتے ہیں میت جس طرح
بند ہو کر پھر نہ آنا صبحِ محشر، ہوش میں
سسکیاں لے لے کے سو جا موت کے آغوش میں
جب مرے سینے میں تو گھٹ کر فنا ہو جائے گی

خاک تیری، میرے حق میں کیمیا ہو جائے گی

خرمنِ امید، اس سینے میں جب جل جائے گا

غم کو ارضِ شادمانی کا پتا چل جائے گا

ایک دکھتے دل کے اندر، اور اتنا شور و شین

اے تمنا، یاد فرما مرگِ سقراط و حسینؑ

ہاں شہادت کے افق ہی پر بصد زورِ شباب

مسکراتا ہے حیاتِ جاوداں کا آفتاب

ہاں جب سینے میں تو گھٹ کر فنا ہو جائے گی

زندگی، رازِ طرب سے آشنا ہو جائے گی

روئے انور کے نظارے بیکراں ہو جائیں گے

"ثم وجہ اللہ" کے معنی عیاں ہو جائیں گے

دردِ دل کو، دردِ عالم کی دوا آجائے گی

میرے دل میں وسعتِ ارض و سما آجائے گی

پھر نہ تڑپوں گا کبھی ذاتی مسرت کے لئے

وقف ہو جاؤں گا آفاقی محبت کے لئے

زخم جو ڈالے گی تُو دل میں رُلانے کے لئے
میں اُسے مرہم بنا دوں گا زمانے کے لئے
عشقِ جاناں، عشقِ حُسنِ جاوداں ہو جائے گا
یہ ستارہ ٹوٹ کر خود اک جہاں ہو جائیگا
اور او ظالم! اگر تو نے نہ مانی میری بات
تنگ آکر بند کر دوں گا میں خود بابِ حیات
مبتلا ہوں گا نہ او کافر تیرے طاعون میں
غرق ہو جاؤں گا خود اپنے ہی دل کے خون میں
خود ہی اِس قیدِ عناصر سے رہا ہو جاؤں گا
تو اگر باقی رہی تو میں فنا ہو جاؤں گا
اور فنا ہو کر بقا کا ہم عناں ہو جاؤنگا
قطرہ ہوں، ٹوٹا، تو بحرِ بیکراں ہو جاؤنگا

جادُو کی سرزمین

غروب، سلسلۂ کوہسار، ویرانہ
سُنا رہی ہے خموشی کو ریل افسانہ
اِدھر پہاڑ، اُدھر کھیتیوں کی پگڈنڈی
ہوائے شام کہیں گرم اور کہیں ٹھنڈی
اِدھر اُدھر کچھ اندھیرے میں مرد و زن ہیں رواں
کہانیوں کے وہ جن ہیں یہ خواب کی پریاں
سیاہیوں میں چمکتی ہوئی جبینیں سی
نظر کے سامنے، جادُو کی سرزمینیں سی
سُرخ اُفق پہ سیہ دھاریوں کی باریکی
پہاڑیوں پہ گھٹا، جھاڑیوں میں تاریکی
شکستہ حال گِدوں کا ہجوم گھوروں پہ
سیہ مشین کا بھورا دھواں کھجوروں پہ

ندی اداس، ہوا دردناک، بن خاموش
زمیں فسوں بہ بغل، آسماں فسانہ بدوش
دو رُویہ تار کے کھمبوں پہ ایک پرتوِ راز
ندی کے موڑ پہ صحرا نشیں دیئے کا گداز
دیئے کی لَو، جو ہواؤں سے جھلملاتی ہے
فروغِ عمرِ گذشتہ کی یاد آتی ہے

تاج کا سایہ

ایک ظلمت سی آ رہی ہے نظر
آج ہندوستاں کے ماتھے پر
لیکن اے تاشناسِ لیل و نہار
تیرہ بختی کے یہ نہیں آثار
بلکہ قدرت نے بادلِ خورسند
تاج کو تا بہ سر کیا ہے بلند
یہ جو ظلمت سی آج طاری ہے
سایۂ تاجِ شہریاری ہے

بجھی ہوئی شمع

مفلس ہوئے تو دہر میں عزت نہیں رہی
آنکھوں میں دوستوں کے مروت نہیں رہی
محبوب کی نظر میں بھی اُلفت نہیں رہی
حد یہ ہے ماں کی آنکھ میں شفقت نہیں رہی

دریائے بے کنارِ جوانی اُتر گیا
موتی کی قدر کیا ہو جو پانی اُتر گیا

وہ زمزمے، وہ لے، وہ ترنم نہیں رہا
وہ چہچے، وہ لطفِ تکلم نہیں رہا
وہ بحرِ دلبری میں تلاطم نہیں رہا
ہونٹوں پہ دوستوں کے تبسم نہیں رہا

جو دل سے تھے فدا، وہی دل توڑنے لگے
جو ہات چومتے تھے وہ منہ موڑنے لگے

مفلس کو، سچ ہے، دھیان میں لاتا نہیں کوئی
بے زر کو اپنے پاس بٹھاتا نہیں کوئی
بے آب آئینے کو اٹھاتا نہیں کوئی
روتے ہوؤں سے آنکھ ملاتا نہیں کوئی

چہرے سے آب اڑی تو کوئی جانتا نہیں
دشمن تو کیا ہیں، دوست بھی پہچانتا نہیں

بگڑی جو بات خلق کے تیور بگڑ گئے — ملتے تھے جھک کے جو وہ یکایک اکڑ گئے
میداں سے پاؤں اہلِ وفا کے اکھڑ گئے — دم میں شبانہ روز کے ساتھی بچھڑ گئے
دوشِ صبا پہ رات کے افسانے اُڑ گئے
گُل ہو گئی جو شمع تو پروانے اُڑ گئے

آ!

آ! کہ سسکتے ہیں بے سازِ مےکشاں ترے بغیر — سربزانو ہے گروہِ مطرباں تیرے بغیر
آگئی ہے کشتیٔ آبِ طرب گرداب میں — بجھ چکی ہے آتشِ رطلِ گراں تیرے بغیر
وہ یقینِ زندگانی، جس پہ کیا کیا ناز تھا — رہ گیا ہے بن کے اک وہم و گماں تیرے بغیر
آ! کہ تیرے ہجر میں بے لالہ و گل ہے زمیں — آ! کہ بے شمس و قمر ہے آسماں تیرے بغیر
زرد ہے رخسارِ گُل افسردہ ہے موجِ صبا
آ! کہ برہم ہے مزاجِ بوستاں تیرے بغیر

دیوانۂ فلسفی

نعرۂ فکر کا بنا یا تھا — میں نے ایسے کو جوشِ ماکر و فون

بھول کر بھی کبھی محبت سے — گرم ہوتا نہیں ہے جس کا خون

جان سو بار اگر فدا کر دو — جو نہ ہو ایک بار بھی ممنون

جس کی سنجیدگی معاذ اللہ — جیسے افریقیہ کے دیار میں جون

جس کی ہر ایک سانس وقتِ جلال — کاربولک کا تُند بُو صابون

مغز جس کا سڑا ہوا لیموں — عقل جس کی جلی ہوئی افیون

شوقِ تفریح و ذوقِ رنگینی — جس کے نزدیک ہیضہ و طاعون

جس کے کردار میں جنون و جمود — جس کی گفتار میں علوم و فنون[1]

لائقِ دار جس کا ہر انداز — قابلِ دار جس کا ہر مضمون

جس کا ہر فعل عقل کا دشمن — جس کا ہر قول شیخ کا قانون

وضع دیکھو تو قاطعِ حکمت — اور باتیں سنو تو افلاطون

"طرفہ معجون تو بہت ہونگے — خیر سے وہ ہے "طرفہ تر معجون"

اُس کو دیکھو، اگر نہ دیکھا ہو

فلسفی کے لباس میں مجنون!

[1] جان بوجھ کر "ن" کا اعلان کیا گیا ہے

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہے تو
چشمِ بد دور کہ خالِ رخِ ایام ہے تو

تیرے چہرے کی سیاہی ہے غلافِ کعبہ
شبِ تاریک میں رعنائیِ الہام ہے تو

تیرے چہرے میں ہے افسانۂ ایماں بالغیب
نقطۂ دائرۂ مسلکِ اسلام ہے تو

تشنۂ گیتی کے لئے تو ہے سیہ مست سحاب
خستۂ دنیا کے لئے نیند کا پیغام ہے تو

تیرے عارض میں ہیں ساون کی اندھیری راتیں
صبحِ وعدہ کی دل افروز خنک شام ہے تو

پیامِ آسودگی

کل صبح، صحنِ باغ میں اک شاعرِ صبور
کہتا تھا یوں کہ سینۂ ظلمت ہے، گنجِ نور

مرہم کا اہتمام ہے ہر زخم کی خلش
درماں کا ساز و برگ ہے ہر درد کا وفور

ہر آہِ دل خراش ہے ہر رشتۂ نشاط
ہر اشکِ لالہ رنگ ہے سرمایۂ سرور

غربت کے دور میں ہے نہاں موسمِ وطن
غیبت کے ساز میں ہے تپاں نغمۂ حضور

ہر غارِ زارِ بیم ہے پیغمبرِ امید
ہر وادیٔ سیاہ ہے پروردگارِ طور

بیدادِ زندگی سے اگر دردمند ہے
آسودہ رہ کہ داد ملے گی تجھے ضرور

رقص یا جانکنی؟

آئی ہے بصد ہزار حسرت — اسٹیج پہ اک ادھیڑ عورت
گھبرا گھبرا کے آنکھ اٹھاتی — تقدیر پہ پیچ و تاب کھاتی
ہنگامۂ فتح، آب و گِل میں — احساسِ شکستِ فاش دل میں
کُھلتی ہوئی عمر کی کمانی — پیری کی گرفت میں جوانی
بجھتی ہوئی رُخ پہ مشعلِ ناز — لہجے میں شکستِ دل کی آواز
چشم و رخسار پر بہ عبرت — پیری کے نشانِ پا کی ہیبت
تھرائی ہوئی شباب کی لَو — رخسار پہ جھریوں کا پرتو
اُڑتی ہوئی خاک سی جبیں پر — اشکوں کا تصور آستیں پر
سر پہ پیری اکڑ کے کُھڑی — ابرو کی کمان اُتری اُتری
رُخ پہ غازہ و عرق جبیں پر — مابین امید و بیم تیور
ہونٹوں پہ خفیف سرد آہیں — کھوئی، نیچی، جھکی نگاہیں
سہمی سی نظر کی ترکتازی — شرمائی ہوئی نگاہ بازی

ہر بال میں محوِ پرفشانی
گزری ہوئی شامِ نوجوانی

پھیکی سی لبوں پہ مسکراہٹ
پیری کے قدم کی دل میں آہٹ

ماتھا، دھڑکن سے سیلا سیلا
انگڑائیوں کا کھچاؤ ڈھیلا

رکتی ہوئی سانس آرزو کی
عشوے پیاسے، نگاہ بھوکی

کب سے ہے شباب گرمِ رحلت
اللہ ری نزع کی طوالت

بے چین ہے، گو بنی ٹھنی ہے
یہ رقص نہیں ہے، جانکنی ہے

تسلّی

بزدلو! تم کیوں سیاسی کشمکش سے ہو اداس
ہاں، تمہارے بال و پر کو چھو نہیں سکتی کمند
گلستاں میں رخصتِ پرواز حاصل ہے تمہیں
ہمّتِ صیّاد کر سکتی نہیں تجھ کو پسند

"شہپرِ زاغ و زغن، شایانِ قید و بند نیست
ایں کرامت ہمرہِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

(حافظ)

ناصحِ مشفق سے خطاب

تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ زنہار نہ پینا
یہ کیوں نہیں کہتے کہ خبردار نہ جینا

کس طرح نہ ڈوبی ہوئی نظروں کو اچھالوں
کیونکر نہ جڑوں دل کی انگوٹھی پہ نگینا

کیا عقل ہے، کہتے ہو مجھے مائلِ پستی
میں عرش پہ چڑھنے کو لگاتا ہوں جو زینا

واللہ کہ فیضانِ مئے ہوش ربا سے
اِنسان سے اِنسان کو رہتا نہیں کینا

دن کو بھی وہی عقل ہے شب کو بھی وہی ہوش
کوثر کی قسم، موت سے بدتر ہے یہ جینا

کیا قہر ہے شب کو بھی نہ ڈھالوں مئے گلرنگ
دن بھر تو بہاتا ہوں میں بیچارہ پسینا

واللہ اگر دوں نہ مئے ناب کے چھینٹے
جلتا ہی رہے شب کو بھی جلتا ہوا سینا

افسوس کہ اب تک تمہیں معلوم نہیں ہے
پینا ہے تو جینا ہے، جو جینا ہے تو پینا

تم کس لئے جلتے ہو، اگر آتشِ تر میں
کھیتا ہے کوئی شخص جوانی کا سفینا

اے ضابطۂ موسم و اوقات کے پابند
مے خانہ کی ہر رات ہے ساون کا مہینا

واللہ کہ یوں مے سے دمکتا ہے دلِ جوش
اِلہام سے جس طرح جھلک اٹھتا ہے سینا

دُہری خدمتیں

تجھکو اے دِل! خود تڑپنا بھی ہے تڑپانا بھی ہے
برق بننا ہی نہیں ہے، برق دوڑانا بھی ہے

آسماں نے کی ہیں دُہری خدمتیں تیرے سپرد
چونکنا بھی ہے تجھے، اوروں کو چونکانا بھی ہے

تجھکو راہِ زندگی پر صرف آنا ہی نہیں
ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لانا بھی ہے

صرف سُننا ہی نہیں تجھکو پیامِ دار و گیر
بلکہ اِس پیغام کو دنیا میں پہونچانا بھی ہے

تا کُجا دیکھے گا خود ہی جوہرِ تیغِ اصیل
اُٹھ، کہ اب اِس تیغ کے لوہے کو منوانا بھی ہے

ہو چکا بس دُور سے نظارۂ پست و بلند
اب تجھے اِن گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھانا بھی ہے

مُنہ سے کہنا ہی نہیں ہے موت کو "عمرِ خضر"
بلکہ مرکب تجکو اس وادی میں دوڑانا بھی ہے

موت سے بڑھکر نہیں کوئی نگہبانِ زیست کا
تجکو یہ نکتہ سمجھنا بھی ہے سمجھانا بھی ہے

منتِ ساقی کا خود پہنے ہے تو گردن میں طوق
ورنہ تیرے حل میں صہبا بھی ہے پیمانہ بھی ہے

کمندِ عشق

واقف بھی ہے کہ حلقۂ حسن و جمال میں
ہمراز بار ترے ہے مرا کس قدر بلند؟

ہر گل پکارتا ہے کہ ہاں میں ہوں عندلیب
ہر ناز کہہ رہا ہے کہ میں ہوں نیاز مند

ہر سبزہ بچھ رہا ہے کہ پامال کر مجھے
ہر غنچہ ملتجی ہے کہ ہو مجھ سے بہرہ مند

شانہ تھا کون جس پہ نہ زلفیں بکھر گئیں
میرے غرورِ عشق نے پھینکی جدھر کمند

جلوؤں نے ہر قدم پہ رکاب آکے چوم لی
میری نگاہِ شوق نے موڑا جدھر سمند

آخر حدودِ حلقہ بگوشی میں آگیا
جس ناز کو نیاز نے میرے کیا پسند

افراطِ شوق سے نگراں ہے مری طرف
کتنے رخوں کی چاندنی، کتنے لبوں کا قند

اللہ ری میری کبر شکن خاکساریاں
سو بار سرنگوں ہوئے خوبانِ سربلند

"آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند"

(عرفی)

مردم شماری

کوئی جا کر یہ کہہ دے افسرِ مردم شماری سے
عجب کیا ہے کہ میرا غنچۂ خاطر بھی کھل جائے
کہ از راہِ کرم مجھ نیم جاں کو بھی خبر کر دیں
اگر اس کوچہ گردی میں کوئی انسان مل جائے

یہ صورت!

الاماں والحفیظ اتنے بھیانک خط و خال!
حضرتِ واعظ مرا زہرہ ہوا جاتا ہے آب
ذہن میں نیچے کے ہو جیسے تخیّل بھوت کا
تپ میں یا دیکھے کوئی جس طور سے ہیضے کا خواب!!

ایک قیامت کی ادا

ہم سفر تھی مرے اِک بار کوئی رہرو جہاں
آج تک اس کا یہ انداز مزا دیتا ہے
نام پوچھا تو کچھ اس طرح بتایا اس نے
جس طرح کوئی خزانے کا پتا دیتا ہے

شاید کام پڑے

ایک معزول معتمد کے پاس
بیٹھے دیکھا جو آج یاروں کو
میں نے کہتے سنا بہ لحنِ خموش
اُن کے عالم فریب اشاروں کو
"پھر اگر برسرِ عمل آنا
بھول جانا نہ خاکساروں کو"

کرب کی آواز

ابنِ آدم کی شادکامی کا
مسئلہ ہے عجیب زہرہ گداز

آدمی کھل کے ہنس نہیں سکتا
غم نہ بخشے اگر پرِ پرواز

ایک کلفت کا عارضی انجام
ایک وقتی طرب کا ہے آغاز

سبزۂ نرم و بسترِ سنجاب
خاروخس کا ہے فرشِ پاانداز

جس میں پنہاں نہو خراشِ الم
کونسا ہے طرب کا وہ انداز

ایک پژمردگیٔ نامحسوس
دہر کی ہر شگفتگی کا ہے راز

ایک مبہم سا نوحۂ ابدی
چھیڑتا ہے مسرتوں کا ساز

قہقہے تک میں جوشِ غلطاں ہے
ایک دھیمی سی کرب کی آواز

ایک تقابل

مالؔ کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدور تھے
آکے ٹھیرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے
اُس طرف ناپاکیاں تھیں، خاک کا انبار تھا
اِس طرف ہر ذرّہ گویا مصر کا بازار تھا
اُس طرف وہ درجہ کیا، ایک دیدۂ بے نور تھا
اِس طرف تقدیر سے روشن چراغِ طور تھا
اُس طرف جورِ خزاں تھا، اِس طرف لطفِ بہار
اُس طرف مزدور تھا، اور اِس طرف سرمایہ دار
اُس طرف جانِ حزیں تھی، ہوسمی جلووں سے دُور
اِس طرف تھا سایۂ ابرِ خراماں کا سُرور
اُس طرف سامانِ دل تنگی تھا چولھے کا دھواں
اِس طرف چہروں پہ تھیں ٹھنڈی ہوا کی سرخیاں

لہ مال گاڑی

اُس طرف ہر آنکھ میں غلطیدہ تھی فکرِ معاش
اس طرف چہرے تھے روشن، اور سینے بے خراش

اُس طرف سرگشتہ تھا بے برگ و باری کا شعور
اس طرف اٹھلا رہا تھا ساز و ساماں کا غرور

چیتھڑوں میں اُس طرف لپٹی ہوئی تھی زندگی
اِس طرف تھی مخمل و سنجاب کی رخشندگی

اُس طرف ہمت کا سر رکھا ہوا تھا خاک پر
اِس طرف تھے ولولوں کے نقشِ پا افلاک پر

اُس طرف موجِ نفس، اِک نالۂ بیتاب تھی
اس طرف تارِ سکوں پر ذہن کی مضراب تھی

آہ اِن دونوں میں اِک شے مشترک جو ہے نہ تھی
اِن کے جوتوں پر چمک تھی، اُن کے چہروں پر نہ تھی

اُس طرف دردِ زیاں تھا، اِس طرف تمکینِ سود
ہو رہی تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ گفت و شنود

اللہ اللہ اِس قدر عدل و تناسب کی کمی

اُس طرف بھی آدمی تھے، اِس طرف بھی آدمی
کوئی محروم، اور کوئی رحمتوں سے بہرہ مند
آدمی، اور آدمی میں اِس قدر پست و بلند!
آہ اِس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون؟
جز خدا اِس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون؟

فروغِ بادہ

چلا ہوں سوئے خمستاں پئے فسردۂ تاک
نگاہ روبرو، اے ساکنانِ عالمِ پاک!
فدائے جامۂ صد چاکِ اہلِ وحشت باد
ہزار خرقۂ افکار و خلعتِ ادراک
فروغِ بادہ سے ہے خاکیوں میں طرفہ خروش
محلِ سجدہ ہے اے نوریانِ ہفت افلاک
فدائے ہمتِ خدامِ حضرتِ ساقی
نہ زندگی سے تعلق کوئی، نہ موت سے باک
ہوئے نہیں ہیں مسخر ہنوز شمس و قمر
ہنوز وقفِ تپش ہے ہر ایک ذرۂ خاک
خدا شراب کو اے جوش سرخرو رکھے
پئے علاجِ لبِ خشک و دیدۂ نمناک

رُفقائے اکبر آباد

دل وفا کا ہے تم سے فریادی — اے رفیقانِ اکبر آبادی

بے رُخی کی بہت ہے خُو تم میں — حُسن بے مہر کی ہے بُو تم میں

حُسن میں خیر ایک لاگ تو ہے — نہ سہی لطفِ غم کی آگ تو ہے

اور تمہارا تو ہے عجب برتاؤ — لاگ ہی جس کو کہہ سکیں، نہ لگاؤ

بعدِ یک عمر بھی ہو گر ملنا — جانتے ہی نہیں ہو تم کھِلنا

ہنستے ہو، اور نہ مسکراتے ہو — بے تعلق نظر اٹھاتے ہو

رہتی ہے خال و خط پہ مستولی — جُون کے آسمان کی خشکی

کر کے برتاؤ اجنبیت کا — توڑ دیتے ہو دِل محبت کا

تم میں بیگانگی جو پاتی ہے — نبضِ احساس چھوٹ جاتی ہے

بوکھلا کر نظر ملاتے ہو — پاس آتے ہی جھینپ جاتے ہو

جانور تک ستم ہے، دُنیا میں — مِل کے اک دوسرے سے صحرا میں

ناچتے ہیں، دُمیں ہلاتے ہیں — دوڑ کر منہ سے منہ ملاتے ہیں

نہ تو ہنستے ہو، اور نہ روتے ہو
اور تم ہو کہ دنگ ہوتے ہو

مل کے ہوتے ہو اس طرح بے حس
جیسے مہماں کے سامنے مفلس!

دعوتِ کیف

وقتِ خنک ہے شغلِ مئے ارغواں کریں
آؤ دعائے دولتِ پیرِ مغاں کریں

اک موجِ نغمہ فرش پہ ہو، ایک عرش پر
یوں خون میں سفینۂ مے کو رواں کریں

ہو جائے آب آب برستی ہوئی گھٹا
یوں، آؤ صحنِ باغ میں جولانیاں کریں

حسبِ مزاج، دہر کو بخشیں حیاتِ نو
حسبِ مراد قاعدۂ آسماں کریں

یارو، رباب اٹھاؤ کہ لوندوں کی تال پر
مدحِ شرابِ کہنہ و حسنِ جواں کریں

جن معجزوں پہ کاوشِ قدرت کو ہے غرور
وہ معجزے پہ جنبشِ رطلِ گراں کریں

ہاں پیش کر کے جوش کو دنیا کے سامنے
آؤ بلند رتبۂ ہندوستاں کریں؟

پُرانی تصویر

ہاں یہی تصویر ہے، جس کو بڑے ارمان سے
میری طفلی نے چھڑایا تھا چکن کے تھان سے
اور پھر بیتاب ہو کر تازہ دم جذبات سے
جس کو چپکایا تھا الماری پر اپنے ہات سے
اُس کا اِک چھوٹا سا ٹکڑا آج بھی تابندہ ہے
یہ بھی اُتنی زندہ ہے، جتنا مرا دل زندہ ہے
ہائے وہ بے داغ راتیں، آہ وہ شفّاف دِن
گوشہ گوشہ امن پرور ذرّہ ذرّہ مُطمئن
دل بھر آتا ہے رہ رہ کر، کہیں تو کیا کہیں
ہائے اِس خلوت گہِ معصوم کی آرائشیں
قمقمے، گھڑیاں، کھلونے، بانسری، البم، ستار
سیپیوں کا نور، جھاڑوں کا کھنکنا بار بار

جھانکنے لگتا تھا اِس کھڑکی سے جب نُورِ سحر
منہ سے بول اُٹھتی تھی یہ تصویرِ مجھ کو دیکھ کر

آسماں پر گھر کے آتا تھا جب ابرِ نو بہار
گنگنا اُٹھتے تھے اِس تصویر کے نقش و نگار

شب کو جب فانوس سے چھنتی تھی دھیمی روشنی
جگمگا اُٹھتا تھا اِس چھینٹی[1] کا سونا اور بھی

منہ اندھیرے دیکھ کر اِس کی سنہری دھاریاں
خاک پر محسوس ہوتی تھیں مجھے گلکاریاں

شب کو اِس کے پاس جب لوبان سلگاتا تھا میں
اس کے آغوشِ فسوں پرور میں سو جاتا تھا میں

ہائے وہ طفلی کے دن بھی کیا تھے اے زخمیِ شباب
خار میں انگڑائیاں لیتے تھے جب لاکھوں گلاب

ننگ نالے تک جواب آبِ رُکنا باد تھے
ایک اک قطرے میں لاکھوں میکدے آباد تھے

[1] تھان پر کاغذ کی جو تصویریں چھپی ہوتی ہیں انہیں "چھینٹی" کہتے ہیں

سیپیوں کو دیکھ کر دل کو وہ ہوتی تھی خوشی
صحن میں چھٹکی ہے گویا موتیوں کی چاندنی

بول اے مٹتی ہوئی تصویر، اے نقشِ وفا
یاد ہے وہ دور جب میں خود بھی اک تصویر تھا
خال و خط میں نور سا، اور نور میں موجِ سرور
پُرسرور آنکھوں میں آبائی امارت کا غرور
چال میں طوفان کی رو، دل میں ساون کا خروش
خون میں بہتے ہوئے چشمے کا بے باکانہ جوش
لب پہ اِک موجِ تبسم، رُخ پہ کلیوں کا سا رنگ
رنگِ رُخ میں تیز فواروں کی بے پروا اُمنگ
کان میں سونے کا دُر، اور جسم پر اچکن سیاہ
بانکپن کے ساتھ پیشانی پہ چیں، نیلی کلاہ
آہ اے تصویر! جب ناواقفِ تمییز تھے
اُن دنوں ہم دونوں پہروں دیکھنے کی چیز تھے
زندگی میں پھر نہ اُس موسم کو پائیں گے کبھی
ہائے وہ بیتے ہوئے دن اب نہ آئیں گے کبھی

انکشافِ توحید

فسوں بدوش ہے کالی گھٹا اندھیری رات
تمام ارض و سما کے چراغ ہیں خاموش

فضاؤں پر نہ تلاطم، نہ بجلیاں، نہ گرج
زمیں پہ نہ تبسم، نہ زمزمے، نہ خروش

مزارِ عرش پہ سنجیدگی، دعا برلب
بساطِ خاک پہ دہشت، جلال در آغوش

رواں ہے لشکرِ سود و زیاں، عناں بہ عناں
رواں ہے قافلۂ کرب و کیف، دوش بدوش

دماغ و دل سے بیک وقت چھیڑ کرتی ہے
ہوائے نرم، باندازۂ پیامِ سروش

جو سامنے ہے تو بس اک حقیقتِ کبریٰ
تمام ارض و سما کا طلسم ہے روپوش

فریبِ غمزۂ اشکال و عشوۂ اسماً
نقاب اٹھائے ہوئے دشت میں ہے جلوہ فروش

بربِ کعبہ جوہر ہے کوئی شے نہ عرض
خدا گواہ کہ فردا ہے کوئی چیز نہ دوش

زمانہ دست و گریباں اصطلاحوں پہ
کسے خبر کہ ہے ہر اصطلاح کفر بدوش

بس اک وجود میں گم ہے تمام موجودات
تمام عالمِ ہستی تمام عالمِ ہوش

یہ رازِ دوست ہے اے جوشؔ نا مآل اندیش
سیاہ کار! خدا کے لئے خموش خموش!!

دو تابوت

پلیٹ فارم پہ رکھے ہوئے ہیں دو تابوت
اِدھر خروش و تلاطم، اُدھر جمود و سکوت

اِدھر حیات کا ذوقِ مسافرت پُرشور
اُدھر ممات کی خاموشیوں کا رُخ سوئے گور

اِدھر حیات کی اُٹھتی جوانیاں گُل پوش
اُدھر ممات کی سنجیدگی کفن بردوش

اُدھر حیات کا دریا ہے ساکن و پایاب
اِدھر ہیں رقص میں موجیں اُبھر رہے ہیں حباب

یہی ہے اصل میں لفظِ حیات کا مفہوم
بتاؤ راہروانِ دیارِ نامعلوم!

یہی نتیجہ ہے کیا ذوقِ کامرانی کا؟
مآل ہے یہی محبوبِ زندگانی کا؟

بشر کا وہمِ خزان و بہار کیا کہئے
فریبِ ہستیٔ ناپائدار کیا کہئے

اصول سے ہے معرّا بہ ایں ہجومِ اصول
بشر سے بڑھ کے نہیں ہے کوئی ظلوم و جہول

ہر ایک سانس میں گو سو عذاب اُٹھاتا ہے
مگر ستم ہے کہ پھر بھی فریب کھاتا ہے

اِن آفتوں میں مگر غور کیا کرے کوئی؟
اگر جیے نہ تو پھر اور کیا کرے کوئی؟

ہُوا کریں جو ہر ایک سانس میں ہیں سو آفات
ہر ایک دل کو عطا کی گئی ہے حُبِّ حیات

دلِ حسینؑ کو فکرِ فُرات بخشی ہے
یہ کس کے ذوقِ ستم نے حیات بخشی ہے؟

خار دیتا جا!

گزر رہا ہے ادھر سے تو اے پیمبرِ گل
مرے چمن کو بھی رنگِ بہار دیتا جا

کلی کو خندۂ گل کی ادا عنایت کر
نسیم کو نفسِ مشکبار دیتا جا

ہجومِ یاس میں جکڑی ہوئی امنگوں کو
خرامِ موج و رمِ آبشار دیتا جا

دیارِ عشق و محبت کی بے خروشی کو
نویدِ بربط و چنگ و ستار دیتا جا

بساطِ غم پہ مچلتی ہوئی تمنا کو
پیامِ دولتِ صبر و قرار دیتا جا

ادا و ناز کے دربارِ شہریاری میں
گدائے خاک نشیں کو بھی بار دیتا جا

سیاہیٔ شبِ تاریکِ تیرہ بختی کو
تبسمِ سحرِ لالہ زار دیتا جا

جلالِ جنبشِ مژگانِ ناتمامی کو
جمالِ چشمکِ تکمیلِ کار دیتا جا

نویدِ رحمتِ پروردگار کے حامل!
نویدِ رحمتِ پروردگار دیتا جا

جہاں ہے دولتِ نقش و نگار سے گلرنگ
مجھے بھی دولتِ نقش و نگار دیتا جا

ہجومِ دردِ شبِ انتظار کا صدقہ
دوائے دردِ شبِ انتظار دیتا جا

خدا بچائے غمِ روزگار سے تجھ کو
کسی کو دادِ غمِ روزگار دیتا جا

غریب جوشؔ کو دیتا نہیں ہے پھول اگر
تو خار میں بھی ہیں سو پھول خار دیتا جا

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل

پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل

پھر جوش پہ ہے موسمِ برنائی جمال
پھر باڑھ پر ہے عشوۂ ترکانہ آج کل

پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشق زمانہ سوز
پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل

پھر لائقِ سجود ہے سیمائے رزمگاہ
پھر قابلِ طواف ہے خم خانہ آج کل

پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل

پھر زندگی، زمان و مکاں پر ہے حکمراں
پھر وقت میں ہے خوئے غلامانہ آج کل

پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بتاں
پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل

پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زلف و رخ
پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل

پھر ہر کلہ ہے تاج ملوکانہ ان دنوں
پھر ہر خزف ہے گوہرِ یکدانہ آج کل

پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل

پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ ان دنوں
پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوشؔ وہ افسانہ آج کل

تحسینِ ناشناس

سنتے ہی میرے شعر پہ افراطِ اضطراب
اک ناشناسِ شعر کا اللہ رے پیچ و تاب

گتھی کبھی جو کھل نہ سکے کھولنے لگا!
آنکھوں میں وزنِ شعر کو دل تولنے لگا

افشائے رازِ جہل کی دہشت سما گئی
چہرے پہ کھنچ کے دل کی ہر اک ضرب آ گئی

شرمندگی، غرور کی سپر ڈھونڈنے لگی
معنی کو ہر سپاٹ نظر ڈھونڈنے لگی

رہ رہ کے ندیاں سی چڑھیں اور اتر گئیں
رُخ سے ہزار رنگ کی موجیں گزر گئیں

کچھ اور خال و خط کو بنانے لگے نڈھال
بھٹکے ہوئے دماغ کے الجھے ہوئے خیال

دل، بارِ زعم و شرم سے بے جان ہو گیا
چہرہ تمام جنگ کا میدان ہو گیا

ژولیدہ طرزِ نطق میں شوقِ نمودِ فہم
آوارہ تیوروں میں یقینِ جمودِ فہم

آنکھوں میں دفعتہً ہوئی گھبرا کے رونما
اخفائے جہلِ شعر کی سعیِ گریز پا

لہجے نے کپکپا کے بصد یاس و عاجزی
میت اٹھائی دعوئے عرفانِ شعر کی

تحسیں کا طرزِ طرفہ توہّم لیے ہوئے
جھینپا ہوا خفیف تبسم لیے ہوئے

جاری ہوئی لبوں پہ جھکائی ہوئی نگاہ
اُڑتی سی "خوب خوب" پھسلتی سی "واہ واہ"

سینے میں نوکِ خنجر چبھی، آنکھ جھک گئی
رگ رگ چلی، زبان ہلی، سانس رُک گئی

چہرہ سُتا، دراز ہوا، سرد ہو گیا
سمٹا، کھنچا، اداس ہوا، زرد ہو گیا

تھوڑی سی نبضِ نطق چلی اور ٹھہر گئی
اک چیخ تھی کہ کون و مکاں سے گزر گئی!

چادر کی بھیک

معاذ اللہ اس شدت کی سردی
نہیں چڑھتا کسی صورت سے پارا

ترشح ہو رہا ہے ہلکا ہلکا
دھوئیں میں گم ہے دریا کا کنارا

صدا یہ دے رہی ہے ایک بڑھیا
کہ بابا میں بہت ہوں بے سہارا

ہوائیں چل رہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی
اڑھا دو کوئی اک چادر خدا را

مدد میں کر سکوں اسے جوش کیونکر
کہ خود گردش میں ہے میرا ستارا

فقط ہلکی سی اس بڑھیا کو چادر
خدایا! داورا! پروردگارا!!

اگر قدم نہ محبّت کا درمیاں ہوتا

اگر قدم نہ محبّت کا درمیاں ہوتا
تو یہ زمیں ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا

نوائے عشق نہ کرتی اگر حُدی خوانی
نہ کارواں، نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا

نہ چھیڑتی اگر انسانیت ترانۂ شوق
زمانہ کشتۂ تسبیحِ قدسیاں ہوتا

صراحیوں کی ہر اک بوند اشک بن جاتی
جوانیوں کا ہر اک عشوہ رائیگاں ہوتا

نہ یہ بہار طرب خیز و غم رُبا ہوتی
نہ یہ فروغِ مئے تُند و ارغواں ہوتا

نہ قدرِ زمزمۂ لعلِ دل نشیں ہوتی
نہ شورِ عربدۂ حُسنِ بے اماں ہوتا

نہ یہ خرامِ نسیمِ بہار کو ملتا!
نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا

نہ خونِ تازہ ٹپکتا دلِ برہمن سے!
نہ آب و رنگِ نقوشِ رخِ بتاں ہوتا

نہ کوئی زمزمۂ عمرِ جاوداں سُنتا!
نہ کوئی بہرہ ورِ مرگِ ناگہاں ہوتا

نہ عقل، عشق و جوانی کے بھید پا سکتی
نہ علم، لالہ رُخوں کا مزاج داں ہوتا

نہ آہِ سرد لبِ زندگی پہ آسکتی
نہ خونِ گرم رگِ دہر میں رواں ہوتا

نہ کوئی سیم بدن آفتِ دل و جاں بنتا
نہ کوئی زہرہ جبیں فتنۂ جہاں ہوتا

نہ موجِ سوز، بہ طنبورِ خستگاں اٹھتی
نہ رقص درو بہ گل بانگِ عاشقاں ہوتا

کبھی نہ غنچۂ کون و مکاں چٹک سکتا
کبھی نہ طفلکِ ارض و سما جواں ہوتا

خدائی قلب کا ہلکا سا وسوسہ ہوتی
خدا ضمیر کا دھندلا سا اک گماں ہوتا

بلند و پست کی نبضیں چھپی چھپی رہتیں
حیات و موت کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا

خدا بکرے وہ جو ہوتا یہی مزاجِ حیات
نہ جانے جوشؔ ٹھکانا مرا کہاں ہوتا

مظلوم بچّہ

بحسبِ مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچّہ
مُحلّہ کا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا

سحر کا وقت ہے، شاداب یاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آ رہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں

پیا پئے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اُٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے

صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اُسے اپنے جگر پہ ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں

تقاضہ کمسنی کا دل میں جب شورش مچاتا ہے
لرز اُٹھتا ہے گردن موڑتا ہے سر کھجاتا ہے

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رُخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

غریب افلاس! تجھ کو دھیان میں لاتی نہیں دنیا
ترے معصوم بچّوں تک کو بہلاتی نہیں دنیا

جادو بیانی

ذرا اُس کی جادو بیانی تو دیکھو
نئے طور کی لن ترانی تو دیکھو!

پراگندہ زلفوں کی پرچھائیوں میں
سن و سال کی ضو فشانی تو دیکھو

مچلتی ہوئی نرم گفتاریوں میں
تڑپتی ندی کی روانی تو دیکھو

تکلم کی رو میں کھنچے ابرؤں کی
یہ این دلبری، قہرمانی تو دیکھو

چھلکتے سے الفاظ کے زیر و بم سے
اُبلتے ہوئے سے معانی تو دیکھو

لچکتی سی ڈالی، چہکتی سی بلبل
ہجومِ خروشِ جوانی تو دیکھو

ہر اک حرفِ ساغر، نکہت کی جلو میں
سرورِ مئے ارغوانی تو دیکھو

مہکتی ہوئی سانس کی تازگی میں
لبِ لعل کی گلستانی تو دیکھو

دہکتی ہوئی عمر کے ولولوں کی
براہِ نظر ترجمانی تو دیکھو

تلفظ کی نادیدہ انگڑائیوں میں
ثمرہ کی ذرا پرفشانی تو دیکھو

برستے سے فقرے، کھنکتے سے جملے
جوانی کی شیریں زبانی تو دیکھو

رخِ تازہ کی چھپی چاندنی میں
تبسم کی گوہر فشانی تو دیکھو

تبسم کی گہرفشاں بجلیوں میں — برستا ہوا ئے کا پانی تو دیکھو
دمِ گفتگو نرگسی انکھڑیوں میں — چمکتی ہوئی بدگمانی تو دیکھو
وہ سن لیں تو اے جوش آفت مچا دیں
مری جراتِ شعر خوانی تو دیکھو!

جوانی کا بسترِ مرگ

سبق عبرت کا لے ناداں! بالوں کی سفیدی سے
کفن اوڑھا ہے جیتے جی، نگارِ زندگانی نے
نظر کر جھرّیوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رخ پر
یہ وہ بستر ہے، دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

صحنِ چمن

آ کہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی
دُور تک سلسلۂ ابرِ رواں ہے ساقی

کُنج میں مرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ خروش
باغ میں بادِ صبا عطر فشاں ہے ساقی

آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے
آج ذرّات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

شاخساروں پہ ہیں مرغانِ چمن گرمِ خروش
آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی

اِس ترنّم میں ازل ہے نہ ابد اے ہمراز
اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی

اِس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف
شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی

غا بدمست ہیں گُل وجد میں کلیاں سرشار
آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی

بزم پر وادیٔ ایمن کا گماں ہوتا ہے
آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی

پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ پیاپے سجدے
شورِ قلقل مجھے کلبانگِ اذاں ہے ساقی

غمِ ایام پہ دم بھر کے لیے غور کریں
اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی

بے خطر ہو کے پلا مئے کہ حقیقت میں قضا
بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی

کھول نغموں سے درِ رمز و اشارات کہ آج
سترِ خوباں پہ حدیثِ دِگراں ہے ساقی

روک رندوں کو نہ تادیر کہ یہ دورِ بہار — موسمِ بندگیٔ لالہ رخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے ہاتھوں — زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی
کیوں سنوں زمزمۂ مدعیانِ عرفاں! — بادہ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
جام دے جام کہ ہر قطرۂ صہبائے کہن — مُصلحِ نسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی
کیفِ صہبا سے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی — فیضِ باراں سے ہر اک ذرہ جواں ہے ساقی
آج جی بھر کے پلا باغ میں گھلتی ہوئی آگ — کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھواں ہے ساقی
چہرۂ خاک کی رنگینیٔ و شوخی کی طرف — عالمِ پاک بحسرت نگراں ہے ساقی
نشہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں — سینۂ ابر میں یوں برقِ تپاں ہے ساقی
اِن کی خلقت نہیں حورانِ بہشتی کے لئے — یہ تو زہاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی
ہاں پلا آتشِ سیال کہ جس کی ہر بوند — شمعِ محرابِ جبانِ گزراں ہے ساقی
اِن لچکتی ہوئی شاخوں کے خنک سائے میں — مئے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ کہ یہ وقت ہے اک شمع سرِ جادۂ باد — اُٹھ اکہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گل رنگ شراب — مایۂ تربیتِ روحِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے — زندگی کو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوشؔ کی بحثِ صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

سرمایہ دار شہریار

موت کے بستر پہ اک دوشیزہ ہے لیٹی ہوئی
جس نے دیکھی ہیں ابھی چودہ بہاریں عمر کی

چہرۂ گل رنگ ہے اس طرح بیماری سے فق
جھٹپٹے کے آخری لمحات کی جیسے شفق

ضعف کی شدت سے ہے یہ رنگ چشم سرگیں
یورشِ اوہام سے پژمردہ ہو جیسے یقیں

دل میں کچھ ہول اُٹھ رہی ہے پے بہ پے رہ رہ کے ہوک
فلسفی کے قلب میں جس طرح چبھتے ہیں شکوک

تابِ رخ یوں مضمحل ہے دیں احساسات کی
کوچ میں ہو چاندنی جس طرح پچھلی رات کی

(۲)

دائے محرومی، مآلِ حسن اور اتنا مہیب
پھیپھڑے ماؤف ہیں اور سانس رکنے کے قریب

پائینتی مجبور ماں بیٹھی ہوئی ہے سرنگوں
کہہ رہی ہے کس سے مانگوں بھیک بولا کیا کروں

سیم و زر تو اک بڑی دولت ہے رب العٰلمین
میرے گھر تو چند پیسوں کے سوا کچھ بھی نہیں

رحم فرما خالق کونین مجھ نادار پر
آج کی یہ رات بھاری ہے بہت بیمار پر

سب کا تو داتا ہے، مجھ نا چیز بندی کے خدا
چند سکے، اے عظیم الشان چاندی کے خدا

کھائے جاتے ہیں مجھے یہ سرد لمحے رات کے
چند ٹکڑے یا الٰہی! چند ٹکڑے دھات کے!!

(۳)

کیا ہؤا جاتا ہے بچّی کو ارے دوڑو کوئی
ہائے تکنے سے ڈھلی جاتی ہے گرسن دُھوپ سی
وہم ہوتا ہے مجھے للہ کچھ تو منہ سے بول
اے زبیدہ، اے زبیدہ، اے زبیدہ آنکھ کھول

(۴)

بعد ازاں ایک آخری ہچکی، مکمل بے بسی
مرغِ جاں کی پَرفشانی، موت کی سنجیدگی

(۵)

لاش کا چہرہ خدا معلوم کیا کہنے لگا
گر پڑی چکرا کے ماں، سر سے لہو بہنے لگا

(۶)

پَو پھٹی اتنے میں، کانپی لاش پر پہلی کرن
لاش تھی، یا سو رہی تھی نیند کی ماتی دلہن
محوِ شیون تھا چراغِ کُشتہ کا ہلکا دھواں
رو رہی تھیں بے زری کی موت کی خاموشیاں
موت کے آغوش میں تھی ایک دیوی حسن کی
زانوئے ظلمت پہ گویا سو رہی تھی چاندنی
کارواں نورِ سحر کا یوں تھا چہرے پر رواں
جیسے دُھندلے آئینے میں پرتوِ ابرِ خزاں

(۷)

سانس لی آبادیوں نے مرغ کی آواز سے
جاگ اُٹھے زردار ہملائے بھی خمِ ناز سے
بے بسو بجی ہچکیوں سے جھنکتے بجتے ہیں رباب
بیکسوں کے آنسوؤں سے کھینچتے ہیں جوشِ آب

(۸)

(الف)

اے پُجاری کے سڑے انگور! اہلِ عزّ و جاہ
آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ!

غرقِ لعنت ہے تمہاری ذات اے نوعِ بشر
شرم سے گڑ جاؤ اے بے مہر فرزندانِ زر

اے امیرو! منہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں
تھیلیوں میں زر تو ہے سینوں میں لیکن دل نہیں

خاک میں مل جاؤ سینوں میں دلِ بے حس لئے
ماش کے آٹے کی صورت اینٹھتے ہو کس لئے

آدمی کب، آدمی کی شکل کے تودے ہو تم
پشتِ مخلوقات پر سرطان کے پھوڑے ہو تم

(ب)

اور اے غاصب حکومت دشمنِ لطف و کرم
موت کے جاڑے ہیں تیرے گیسوؤں کے پیچ و خم

ہو نہیں سکتا ہے حاصل اُس حکومت کو دوام
پیٹ بھر کر کھا نہ سکتے ہوں کبھی جس کے غلام

ہم نے یہ مانا کہ غفلت کیش ہیں، نادان ہیں
اے حکومت! پھر بھی ہم حیواں نہیں انسان ہیں

ڈالتی ہے دل میں تو وہ زخم جو بھرتا نہیں
یہ ستم تو کوئی حیوانوں پہ بھی کرتا نہیں

جُوتیاں تک چھین لے انسان کی جو سامراج
کیا اُسے یہ حق پہنچتا ہے کہ رکھے سر پہ تاج؟

جس کے لاتعداد مُردوں کو کفن ملتا نہیں
اُس کے پرچم کو نِگل جاتی ہے بالآخر زمیں

لے یہ سر ہے، یہ جگر، یہ دل ہے، لے[1] منحوس لے
چُوس لے جتنا لہو باقی ہے، وہ بھی چُوس لے

---

[1] کینۂ پُرزور

(ناتمام)

جہاں میں تھا

شبِ آغوشِ چمن میں صبحِ خنداں تھی جہاں میں تھا
ہوائے سرد موجِ آبِ حیواں تھی جہاں میں تھا

زمیں کے چہرۂ رنگیں سے ایسی لَو نکلتی ہے
فلک کی شمع رہنِ طاقِ نسیاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے صحنِ رنگیں پر حقائق یوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسم ریز رُخِ شبنمستاں تھی جہاں میں تھا

فرازِ ذہن کے رومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز برقِ روئے تاباں تھی جہاں میں تھا

شعاعِ عارضِ افسانۂ روئے مجازی سے
حقیقت مضطرب سر در گریباں تھی جہاں میں تھا

صنم بردوش و کفر انگیز محرابِ کلیسا میں
حرم کی شمعِ ایمانی فروزاں تھی جہاں میں تھا

حقائق کے معطر جامعِ اضداد بستر پر
بہم خوابیدہ روحِ کفر و ایماں تھی جہاں میں تھا

سرشتِ آدم و ابلیس تھی یوں محوِ سرگوشی
خجل آویزشِ یزداں و شیطاں تھی جہاں میں تھا

چمن کے سروِ آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی جہاں میں تھا

ز راہِ معدلت کوشی زبانِ مریمِ عصمت
جنونِ ذوقِ عصیاں کی ثنا خواں تھی جہاں میں تھا

ستارے نقش بر دیوار تھے، مہتاب سکتے میں
مشیت گوش بر آوازِ زنداں تھی جہاں میں تھا

سرشکِ گریۂ پنہاں کی ظلمت خیز بارش میں
نگارِ خندۂ عشرت غزل خواں تھی جہاں میں تھا

عروسِ وقت کی خواب آفریں آسودہ گامی سے
سبک رفتار نبضِ چرخِ گرداں تھی جہاں میں تھا

کبھی چہرے دمکتے تھے کبھی زلفیں بکھرتی تھیں
حقیقت نیم پیدا نیم پنہاں تھی جہاں میں تھا

کسی چشمِ سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے
ہر اک ذرہ میں اک روحِ شبستاں تھی جہاں میں تھا

مہکتے مسکراتے نیم وا غنچوں کے جھرمٹ میں
جوانی کی شکر خوابی پر افشاں تھی جہاں میں تھا

وفورِ آرزو سے جنبشِ دستِ زلیخا میں
عروسِ یوسفیت چاک داماں تھی جہاں میں تھا

قریبِ آبِ جو میدان کے دھندلے کناروں پر
محبت کاکلیں کھولے خراماں تھی جہاں میں تھا

ملایک ہی نہ تھے سجدے میں پیشِ آدمِ خاکی
الوہیت بھی زیرِ دامِ انساں تھی جہاں میں تھا

رباعی

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں
اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس، کہ امیروں کے گناتے ہیں گناہ
دولت انہیں دیدو تو قیامت کر دیں

پیرِ مغاں - دیکھ!

ہاں دیکھ، ہر اک ذرّہ ہے اک باغِ جناں دیکھ
ہر خارِ مغیلاں پہ ہے جنّت کا گماں دیکھ
گلشن پہ ہے گھنگھور گھٹاؤں کا دھواں دیکھ
اور اُس پہ یہ لب تشنگیٔ بادہ کشاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

یوں سایۂ کاکل میں ہے اک روئے کتابی
جس طرح گھٹاؤں میں جھلکتی ہو گلابی
دے جام کہ ایماں کی نہ ہو خانہ خرابی
تسنیم کی سوگند سوئے تشنہ لباں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

دن ڈوب چلا مشعلِ امید جلا دے
اُٹھ پائے صراحی پہ جبینوں کو جھکا دے
کہہ قلقلِ مینا سے کہ تکبیر سُنا دے

ہے وقتِ اذاں وقتِ اذاں وقتِ اذاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

ہر دیدۂ گریاں میں تبسم ہے پُرافشاں
کیوں کشمکشِ سود و زیاں سے ہے پریشاں
ہر درد کے آغوش میں ہے تسلیٔ درماں

ہر چاک ہے اک کارگہِ بخیہ گراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

مانا کہ مناظر ہیں تبسم ہی تبسم!
گو دید کے قابل ہے یہ جلووں کا تلاطم
لیکن جو مناسب ہو تو از راہِ ترحم

اِس سمت بھی اے قبلۂ صاحب نظراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

ہر آن ترانے سے برستا ہے ترانہ
بیتاب ہے، بدمست ہے، بیخود ہے زمانہ
کو کو ہے اُدھر اور اِدھر چنگ و چغانہ

یہ نغمۂ نوخیز، وہ گلبانگِ جواں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

ہم چُپ ہیں تو مدّھم ہیں حسینوں کے بھی جلوے
ہم چہکیں تو چہکیں گے یہ گلرنگ شگوفے
دانا ہے تو پہلے ہمیں دو گھونٹ پلا دے

پھر عشوۂ ترکانۂ خوبانِ جہاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

خورشیدِ طرب ہے افقِ گُل سے نمودار
گاتے ہیں ہواؤں سے لچکتے ہوئے اشجار
آتی ہے گھنی چھاؤں سے پازیب کی جھنکار

رنگِ چمن و عربدۂ زہرہ وشاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

خود پی کے حریفوں کو بھی اِک جام پلا دے
وہ جام کہ تفصیل کو اجمال بنا دے
گُل رنگ سی اک سامنے دیوار اٹھا دے

کونین کو آ نیمِ عیاں، نیم نہاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

اب نیم نفس بھی نہیں تاخیر گوارا
ہاں جلد پلا، جلد پلا، جلد خدارا
بھرنے ہی پہ ہے ابلقِ ایام ترارا

مڑنے ہی پہ ہے قافلۂ عمرِ رواں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

قبلے سے برستا ہؤا آتا ہے وہ پانی
شوخی ہے، شرارت ہے رواں ہے روانی
ہر سُو ہے جوانی ہی جوانی

گردوں کی نظر ہے سوئے گیتی نگراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

شیشوں کی طرف ہیں ترے مستوں کی نگاہیں
ہاں بہرِ خدا کھول بھی دے رقص کی راہیں
بے جام تو کج ہوں گی نہ رندوں کی کلاہیں

بانکا ہے تو ایمائے خمِ آبِ رواں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

نغموں سے کوئی ماہِ لقا جھوم رہی ہے
شانوں پہ گھنی زلفِ دوتا جھوم رہی ہے
یا سروِ خراماں پہ گھٹا جھوم رہی ہے

آ نہرِ جناں، باغِ جناں حورِ جناں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

آموں کی گھنی چھاؤں ہے، کوکو کی صدائیں
سرشار فضا، مست چمن، سرد ہوائیں
پستی میں گُل و لالہ، بلندی پہ گھٹائیں

برنائی سلمائے جہانِ گزراں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں دیکھ
ہاں پیرِ مغاں دیکھ

نوحۂ زندگانی

کہیں تجھ سے کیا حال، اے یارِ جانی — بڑی بے دلی ہے، بڑی سرگرانی
فراغت ہے آنی، مسرت ہے فانی — مآلِ مسرت غمِ جاودانی

غمِ جاودانی، غمِ جاودانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

کھلونوں کا تھا پہلے کیا کیا تقاضا — نئی ایک ضد تھی، نیا ایک غوغا
اور اب ولولے دل میں ہیں کارفرما — نئی ایک حسرت، نئی اک تمنا

نہ طفلی ہی خوش تھی، نہ خوش ہے جوانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

لگا ہے وہ گھن، جان و دل گھن رہے ہیں — کہیں کیا، دل و دیدہ کیوں بھن رہے ہیں
حوادث کی چنگاریاں چن رہے ہیں — جسے آپ سن سن کے سر دھن رہے ہیں

نرا خونِ دل ہے یہ رنگیں بیانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

عقیدت کے پھندے، عقوبت کے چکر عقائد کا سیلاب، ایماں کی صرصر
تلاطم ہے محراب، طوفاں ہے منبر یہاں پار بیڑا لگے بھی تو کیونکر

جنوں ناخدا اور کشتی پرانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

ہر اک زلف کتنی ہے برہم، نہ پوچھو حکایاتِ مژگانِ پرنم، نہ پوچھو
دھڑکتا ہے کیوں قلبِ آدم، نہ پوچھو تمنا کی دنیا کا عالم، نہ پوچھو

یہاں آگ ٹھنڈی ہے اور گرم پانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

بلایا، نکالا، بٹھایا، اٹھایا چڑھاتے ہی سر پر، نظر سے گرایا
جو دم بھر ہنسایا، تو برسوں رلایا تو پھر موت کہتے ہیں کس کو خدایا

اسی کا اگر نام ہے زندگانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

اگر ذہن کے تن پہ بوٹی ہے بابا اگر عقل قسمت سے موٹی ہے بابا
تو پھر زندگی، دال روٹی ہے بابا نہیں تو ہر اک چیز کھوٹی ہے بابا

نہ سمجھا تو مورکھ، جو سمجھا تو گیانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

زمانے کا لطف و کرم بھی جفا ہے ۔۔۔ مصیبت ہی دنیا میں فرمانروا ہے
ستم ابتدا ہے، ستم انتہا ہے ۔۔۔ بتادوں "غم" و "عیش" میں فرق کیا ہے

وہ سوزِ عیاں ہے، یہ سوزِ نہانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

ہو مرہم بھی جب اک نیاز خم کاری ۔۔۔ خوشی کا ہو ردِ عمل اشکباری
نتیجہ ہو تسکین کا بے قراری ۔۔۔ جب انجامِ عشرت بھی ہو سوگواری

مشیت سے پھر کیوں نہ ہو بدگمانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

خوشی کی نظر، گو نہیں تنگ یارو ۔۔۔ خوشی غم سے کرتی ہے گو جنگ یارو
مگر دل ہے اس بات سے دنگ یارو ۔۔۔ کہ ہر جادۂ رامش و رنگ یارو

مڑا ہے سوئے منزلِ نوحہ خوانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

مصائب کا، ہر سانس ہے اک فسانہ　　مصائب کا مارا ہوا ہے زمانہ
ترانہ فغاں ہے، فغاں ہے ترانہ　　مجھے کیا لبھائے گا چنگ و چغانہ

کہ وہ بھی تو غم ہی کی ہے ترجمانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

ہر اک لَے ہے اک التجائے ترحّم　　خراشِ جگر ہے، خروشِ ترنّم
خراشِ جگر کا کہوں کیا تلاطم　　جو کم ہو تو بنتی ہے موجِ تبسم

جو گہری ہو تو آنسوؤں کی روانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

بس اک وہم ہے وہم، رنگین دنیا　　حبابوں کے قلعے، سرابوں کے دریا
غلط در غلط ہے، نظر ہو کہ جلوا　　اُٹھے رنگ و بُو کے جو پردے تو دیکھا

نہ شامیں سلونی، نہ صبحیں سہانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

مسائل سے کب تک نہ پیچھا چھڑاتے؟　　مصائب پہ تا چند آنسو بہاتے
مسرت کا انجام کیونکر بھلاتے؟　　جب اُکتا گئی روح، غم کھاتے کھاتے

تو گھبرا کے پی لی مئے ارغوانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

ٹپکتا ہو جب شہد، موجِ صبا سے
جھلکتی ہو جب شادمانی فضا سے
برستی ہو جب زندگانی گھٹا سے
تو اُس وقت سمجھو کہ فضلِ خدا سے

اب آئی کوئی آفتِ ناگہانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

متاعِ غمِ جاودانی عطا کی
غم و غصہ و سرگرانی عطا کی
تمنا کی ناکامرانی عطا کی
مجھے آپ نے زندگانی عطا کی

بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی
بڑی دکھ بھری ہے ہماری کہانی

دینِ آدمیّت

جب کبھی بھولے سے اپنے ہوش میں ہوتا ہوں میں
دیر تک بھٹکے ہوئے انسان پر روتا ہوں میں
اقتضائے وقت سے تھا کل جو خالص اک رواج
ارتقائے وہم سے وہ دولتِ ایماں ہے آج
اب بھی عینِ عقل ہے، ماضی کا ہر وہم و قیاس
کل کے "جوجو" نے پہن رکھا ہے "دیوتا" کا لباس
جس کی انگلی تھام کر بچپن اٹھاتا تھا قدم
آج بھی محتاج ہیں، بچپن کی اُس دایا کے ہم
کس سے کہئے، تھا جو کل طفلی میں صحت کا امیں
نوجوانی میں وہ نسخہ کام دے سکتا نہیں
ایشیا والو، یہ آخر کیا خدا کی مار ہے
کل جو گھٹی پی تھی اُس پہ آج تک اصرار ہے

مسلکِ اجداد سے وابستگی ایمان ہے
یہ فقط تقلید کے سرسام کا ہذیان ہے
یہ مسلماں ہے، وہ ہندو، یہ مسیحی، وہ یہود
اس پہ یہ پابندیاں ہیں، اور اُس پر یہ قیود
شیخ و پنڈت نے بھی کیا احمق بنایا ہے ہمیں
چھوٹے چھوٹے تنگ خانوں میں بٹھایا ہے ہمیں
قصرِ انسانی پہ ظلم و جہل برساتی ہوئی
جھنڈیاں کتنی نظر آتی ہیں لہراتی ہوئی
کوئی اِس ظلمت میں صورت ہی نہیں ہے نور کی
مُہر ہر دل پہ لگی ہے اک نہ اک دستور کی
گھٹتے گھٹتے مہرِ عالم تاب سے تارا ہوا
آدمی ہے مذہب و تہذیب کا مارا ہوا
کچھ تمدن کے خلف، کچھ دین کے فرزند ہیں
قلزموں کے رہنے والے، بلبلوں میں بند ہیں
قابلِ عبرت ہے یہ محدودیت انسان کی

چھٹیاں چپکی ہوئی ہیں مختلف ادیان کی
پھر رہا ہے آدمی، بھولا ہوا، بھٹکا ہوا
اک نہ اک "لیبل" ہر اک ماتھے پہ ہے لٹکا ہوا
آخر انساں تنگ سانچوں میں ڈھلا جاتا ہے کیوں
"آدمی" کہتے ہوئے اپنے کو شرماتا ہے کیوں
خوردنی اشیا کا بھی یاں اک نہ اک آئین ہے
آم اگر دیندار ہے، تو سنترا بے دین ہے
کیا کرے ہندوستاں "اللہ" کی ہے یہ بھی دین
چائے ہندو، دودھ مسلم، ناریل سکھ، بیر جین
اپنے ہم جنسوں کے کینے سے بھلا کیا فائدہ
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جینے سے بھلا کیا فائدہ

(۲)

نوجوانو! یہ بڑے بوڑھے، نہ مانیں گے کبھی
صحتِ افکار سے خالی ہے ان کی زندگی
صبح کا جب نام آتا ہے تو سو جاتے ہیں یہ

روشنی کو دیکھتے ہی کور ہو جاتے ہیں یہ

اِن کے شانوں پر تو ایسے سر ہیں، اے اہلِ نگاہ

جن کا گودا اجل چکا ہے، جن کے خانے ہیں سیاہ

اور وہ خانے ہیں، جن تک روشنی جاتی نہیں

آندھیوں کے وقت بھی جن میں ہوا آتی نہیں

بجھ چکے ہیں جہل کے جھونکوں سے اِن سب کے چراغ

کب سے ہیں ضیق النفس میں مبتلا اُن کے دماغ

اِن کی عقل پوچ اک مدت سے ہے خلوت گزیں

فکر کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لے سکتی نہیں

دیر سے عقلیں ہیں ان کی قبض مزمن سے دوچار

ذہن ہیں تقلید کے وجع مفاصل کا شکار

کانپتے ہیں یہ "خدا" و "اہرمن کے سامنے

اب بھی جھکتے ہیں روایاتِ کہن کے سامنے

یوم پیدائش سے ہیں یہ اپنے سینوں میں لئے

کانپتے بوڑھے عقیدے، تھرتھراتے وسوسے

معتقد ہیں اب بھی اُن ادیان کے یہ بکر و زید

دانت جن کے گر چکے ہیں جن کی پلکیں ہیں سفید

ذہن اِن کے رینگتے پھرتے ہیں زیرِ آسماں

اپنی لغلوں میں دبائے وہم کی بے ساکھیاں

اِن سے بڑھ کر نورِ حکمت کا کوئی دشمن نہیں

اِن کے تہ خانوں میں روشندان کیا، روزن نہیں

کیوں نہ اُٹھے عقل کے سینے سے رہ رہ کر دھواں

دین کے تابوت کی یہ زندہ لاشیں، الاماں

دین کیا ہے، خوفِ دوزخ، حرصِ جنّت کے سوا

رسمِ تقویٰ کچھ نہیں جُبن[1] و تجارت کے سوا

اللہ اللہ یہ مقدس عالمانِ پُرشکوہ

تاجروں کی اک جماعت، بزدلوں کا اِک گروہ

سینکڑوں حوروں کا ہر نیکی پہ ہے اِن کو یقیں

سُود لینے میں "خدا" سے بھی یہ شرماتے نہیں

بند پانی سے اِنہیں کیا آ سکے بُوئے فساد

[1] بزدلی

یہ تو ہیں "شخصی خدا"[1] کے بندگانِ خانہ زاد
اِن کو اُس اصلی "خدا" سے دُور کی نسبت نہیں
جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قدموں پر زمیں
آج تک پہونچی نہیں جس اوج تک چشمِ خیال
ایک نامعلوم قوت، ایک نادیدہ جلال
داغِ "شخصیت" سے ہے ناآشنا جس کی جبیں
نوعِ انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں
جس کا ہر تارا ہے مُصحف جس کا ہر ذرہ کتاب
جس کے دفتر کی ہے زرّیں مُہر قرصِ آفتاب
وُہ "خدا" وہ طاقتِ مخفی، وہ دارائے حیات
جس کی اِک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات
اُس کی کوئی ابتدا ہے، اور نہ کوئی انتہا
لیکن اِن اربابِ مذہب کا نرالا ہے "خدا"

وہ "خدا" جو آدمی سے چاہتا ہے بندگی

[1] Personal God

تشنگی جس کو بہت ہے خوشنما الفاظ کی

فاتحہ کا نان و حلویٰ، آئے دن کھاتا ہے جو

انگلیوں پر روز اپنا نام گنواتا ہے جو

سرنگوں رہتا ہے جو اہلِ فتن کے سامنے

جس کی کچھ چلتی نہیں ہے اہرمن کے سامنے

روندتا رہتا ہے جس کی "خیر" کو ابلیسِ "شر"

چاہتے ہیں جس کے ناداروں کے پیچھے اہلِ زر

گرگ سیرت ڈاکوؤں کو تاج پہناتا ہے جو

"مومنوں" کو "کافروں" سے بھیک منگواتا ہے جو

"مجکو پوجو" "مجکو چاہو" کی صدا دیتا ہے جو

جو نہ چاہے، اُس کو دوزخ کی سزا دیتا ہے جو

حکم ہے جس کا کہ یوں انگلی ہلانا چاہیئے

جب جماہی آئے تو چٹکی بجانا چاہیئے

مر کے جلنا، یا کسی دریا میں بہنا چاہیئے

چھینک جب آئے "معاً" "الحمد" کہنا چاہیئے

جو، اگر یوں جسم نہ ہو گردن، تو کرنا ہے بھسم
یوں جبیں کو ٹیک دو، تو مائلِ جود و کرم
یوں ہوں ماتھے پر لکیریں، تو دعا ہو مستجاب
مُنہ پُھلا کر یوں اگر تو نبی سجاؤ تو ثواب
اِس طرح زلفیں بنانے، یوں کترنے میں ثواب
اِس طرح اُلٹے لٹک کر یاد کرنے میں نجات
جس کے آگے رقص کرنا، گنگنانا ہے حرام
جس کے آگے قہقہہ کیا، مسکرانا ہے حرام
جس کے آگے کانپنا، آنسو بہانا ہے ثواب
جس کے آگے سر جھکانا گڑگڑانا ہے ثواب
جس کے آگے زمزمہ، پیمانہ، ساقی، سب حرام
صرف آبِ سرد و نانِ گرم، باقی سب حرام
مست ہوتا ہے جو یُوں اِنسان کی تحسین پر
پھَن اُٹھا کر جھومتا ہے ناگ جیسے بین پر
فطرتِ انساں کا خالق ہو کے بھی جو صبح و شام

بے خطا انسان سے لیتا ہے کیا کیا انتقام
گاہ آتا ہے یہاں طوفان پر ہو کر سوار
گاہ غصے میں ہلاتا ہے زمیں کو بار بار!
جو اگر خوش ہے تو دیتا ہے بشر کو انگبیں
ڈال کی توڑی کھجوریں، کورے پنڈے کے حسیں
اور اگر بگڑا تو چھپ جاتا ہے چہرا جھاگ میں
آدمی کو جھونک دیتا ہے، دہکتی آگ میں
گاہ ہوتا ہے مصر، انعام پر احسان پر
پیٹتا ہے دانت رہ رہ کر کبھی انسان پر
جس نے لاکھوں راہبر بھیجے ہدایت کے لئے
روند ڈالا جس نے اِس کثرت کو وحدت کے لئے
خون گو سو بار اُس کے آستاں پر بہ گیا
پھر بھی جو اپنے مشن میں فیل ہو کر رہ گیا
جس کی کشتی، جوئے سرتابی کی رو میں بہ گئی
جس "خدا" کی "ضربِ آخر" بھی اُچٹ کر رہ گئی

چار دن جو شاد ہے، اور چار دن ناشاد ہے
یہ "خدا" تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے
سخت حیراں ہوں، یہ کیسا وہم کا طوفان ہے
اے عزیزو! یہ خدا کے بھیس میں "انسان" ہے
مدتیں گزریں کہ عقلِ انجمن مدقوق ہے
دوستو، ایسا "خدا" "خالق" نہیں مخلوق ہے

اُٹھ کھڑے ہوں، آؤ تکمیلِ عبادت کے لئے
اِک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کے لئے
آؤ محفل میں جلائیں پھر بصد شانِ فراغ
نوعِ انسانی کی مجموعی اخوت کا چراغ
اور کچھ حاجت نہیں ہے دوستی کے واسطے
آدمی ہونا ہے کافی، آدمی کے واسطے
آؤ وہ صورت نکالیں جس کے اندر جان ہے
آدمیت دین ہو، انسانیت ایمان ہو
آدمیت سے کوئی شے دہر میں
میں شرابِ وہم آبائی کا متوالا نہیں

———

رہزنی یا رہبری

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد
میں جو کچھ ہمنشیں سمجھا رہا ہوں

نہ جا اِن کفر کی باتوں پہ میری
یہ حق کے گیت ہیں جو گا رہا ہوں

الجھتا ہوں زبوں عقلوں سے جتنا
خود اپنے سے سلجھتا جا رہا ہوں

بشکلِ رہزنی ہر قافلے کو
حقیقی راستے بتلا رہا ہوں

تفکر چھا رہا ہے مجھ پہ جتنا
میں اُتنا زندگی پر چھا رہا ہوں

بغاوت کی ہوا کے بازوؤں پر
وفا کی سمت اڑتا جا رہا ہوں

ہوائے تند سے لڑتا جھگڑتا
گھٹا کی طرح گھِرتا آ رہا ہوں

جسے یوں کھو رہا ہوں ہر قدم پر
اُسی کو ہر نفس میں پا رہا ہوں

اُسی کے بُعد پہ نازاں ہوں اتنا
اُسی کے قرب پر اترا رہا ہوں

اُسی کے رمز سے آگاہ ہو کر
اُسی کی بات کو جھٹلا رہا ہوں

اُسی کے نام کو تاریک کر کے
اُسی کی ذات کو چمکا رہا ہوں

رُباعی

اے صیدِ ہوس، آگ غمِ ہستی کی
مجکو بھی جلا رہی ہے اور تجکو بھی
میرے جلنے میں عود کی ہے خوشبو
اور تجھ میں وہ بُو ہے جیسے جلتی ہڈی

تصوّر

جوشؔ آنکھوں میں پھر رہی ہے آج ایک جانِ حیا کی یوں تصویر
زیرِ محرابِ دیر پچھلے پہر جس طرح خندۂ سراجِ منیر

جیسے ظلمت میں چشمۂ حیواں
جیسے قرآں میں آیۂ تطہیر

ہوس و عشق

کل ایک صیدِ ہوس نے یہ مسکرا کے کہا کہ تجھ کو عشق و محبت کا ہے بڑا دعویٰ
طرب کا غم ہے، دونوں ہی کے فسانے ہیں مآلِ عشق و ہوس ایک ہے زمانے میں
ہوائے شوق کا میں بھی غبار ہوں تو بھی غمِ نہفتہ کا میں بھی شکار ہوں تو بھی
مرادِ یار بھی ویراں ہے تو بھی خانہ خراب تو اس کی بات کا میں نے دیا یہ ہنس کے جواب
جہانِ حسن و محبت کا تاجدار ہوں میں خزاں گزیدہ ہے تو، کشتۂ بہار ہوں میں

ترے چبھوتے ہیں کانٹے جلی بگولوں نے
مجھے نگار کیا ہے شگفتہ پھولوں نے